طلوعِ اسلام

مقصد طلوعِ اسلام کا مسلک اور

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

1. تنہا عقلِ انسانی، زندگی کے مسائل حل کرنے سے قاصر ہے۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے جس سے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
3. حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے، جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔
4. حضور نبی اکرم انسانی بشر ہونے کے لحاظ سے [illegible] جن پر حضور کی [illegible] کی درستی کا معیار خود قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دین [illegible] ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. اس نظام کی تشکیل [illegible] قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں [illegible] جزئی قوانین [illegible] بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما [illegible] معاشرہ ان کی ضروریاتِ زندگی [illegible]
8. ربوبیت کے مقصد عظیم کے حصول کیلئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرہ کی تحویل میں رہیں [illegible] اسی کو قرآنی نظام ربوبیت کہا جاتا ہے۔ ہمارا مقصد [illegible] پاکستان میں [illegible] قرآنی نظام ربوبیت [illegible] ذریعہ بن جائے۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک و مقصد سے متفق ہیں تو [illegible] طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اگست ۱۹۵۲

بتقریب جشن آزادی

-/10/-

ترجمان حقیقت محترم پرویز صاحب کے قلم سے

سلیم کے نام خطوط

ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جسقدر شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ شاداب اور سائنٹفک انداز میں تسکین بخش جواب

ان خطوط میں ملت کے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کیا گیا ہے جو مشرق و مغرب کے تصادم کے بعد دور ملوکیت کے وضع کردہ غلط مذہبی تصورات سے متنفر ہوتے ہوتے اسلام اور اس کے سرچشمہ حیات، قرآن سے بھی ہاتھ دھو چلا تھا عقائد و نظریات۔ جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکۃ آراء مسائل حل کرکے رکھ دئے گئے ہیں جنہیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جاسکا تھا۔ یہ خطوط ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین وصول کرچکے ہیں۔ قرآن کی روشنی اور محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز قلم۔ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اس مجموعہ میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو طلوع اسلام میں شائع ہوچکے ہیں اور وہ بھی جو ابتک کہیں شائع نہیں ہوئے۔

کتاب بڑے سائز کے قریب سوا چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید۔ گرد پوش مصور مشرق جناب چغتائی کے حسین قلم کا مرقع۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف چھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)	سعید احمد	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) " غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۶	اگست ۱۹۵۳ء	نمبر ۸

فہرست مضامین

۱۵ اگست کیوں آتا ہے؟ — ۴

لمعات — ۵ - ۱۱

حلقۂ معاونین طلوع اسلام — ۱۲ - ۱۳

وراثتِ ارض کا ابدی قانون (محترم پرویز صاحب) — ۱۴ - ۳۳

کہنے والے ہیں — ۳۴

کوئی دن اور (محترم عرشی صاحب) — ۳۵ - ۳۹

مراہیں! (محترم پرویز صاحب) — ۴۰ - ۴۲

رفتارِ عالم — ۴۳ - ۵۶

حقائق و عبر — ۵۷ - ۵۸

۱- مُلّا کی ہڑتال

۲- ناقدر شناس قوم!

نزولِ عیسیٰ بن مریمؑ کی حدیثیں اور ان کی تنقید (علامہ تمنا عمادی) — ۵۹ - ۶۸

باب المراسلات — ۶۹ - ۷۲

طاہرہ کے نام... (محترم پرویز صاحب)

* * *

۱۵ر اگست کیوں آتا ہے؟

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک مرتبہ قحط پڑ گیا تو اردگرد کی ساری آبادی سمٹ کر مدینے میں جمع ہو گئی۔ نئی نئی مملکت کیلئے یہ مسئلہ (PROBLEM) بڑا اہم اور مرحلہ بڑا مشکل تھا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیدیا کہ مدینے میں کوئی شخص اپنے گھر میں کھانا نہیں کھائے گا، نہ ہی کسی کے ہاں انفرادی طور پر کچھ پکے گا۔ جو کچھ کسی کے پاس ہے سب ایک جگہ جمع ہوگا اور سب کو ان "پناہ گزینوں" کے ساتھ مل کر ایک دسترخوان پر کھانا ہوگا۔ اس حکم کی تعمیل میں خود امیرالمومنین کا گھرانہ پیش پیش تھا۔ مسلسل فاقوں سے اور موٹی جھوٹی روٹی کھانے سے آپ بیمار ہو گئے۔ چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی۔ رفقاء نے کئی مرتبہ کہا کہ آپ نسبتاً اچھی غذا کھائیے۔ ملت کو آپ کی صحت کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ یہ سنتے اور انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیتے کہ

خونِ شہ رنگین تر از معمار نیست

ایک دن آپ نے دیکھا کہ آپ کا پوتا خربوزہ کھا رہا ہے۔ اپنے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) کو بلایا اور کہا کہ مسلمانوں کے بچے روٹی کے ٹکڑے کو ترس رہے ہیں اور عمر کا پوتا پھل کھا رہا ہے؟ اس کا کوئی جواب تمہارے پاس ہے؟ انھوں نے کہا کہ بچے کو صبح (دوسرے بچوں کے ساتھ) جو کھجور کی گٹھلیاں ملی تھیں، اس نے ان کے بدلے ایک بدو لڑکے سے خربوزہ لے لیا تھا۔ یہ ہے حقیقت اس "میوہ خوری" کی، ورنہ عمر کے گھر والوں کو بھی وہی کچھ ملتا ہے جو دوسرے قحط زدہ مسلمانوں کو ملتا ہے۔ حضرت عمرؓ لوگوں کے غم میں اسقدر نڈھال تھے کہ (حضرت اسامہؓ بن زید کے بیان کے مطابق) صحابہ کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اگر قحط رفع نہ ہوا تو عمرؓ مسلمانوں کے غم میں جان دیدیں گے۔ اس کے ساتھ ہی قحط کے دور کرنے کی دوسری تدابیر بھی اختیار کی جارہی تھیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد قحط رفع ہو گیا۔

۱۵ر اگست ہر سال یہ دیکھنے کے لئے آتا ہے کہ "عمر اور اس کا پوتا" کون سے دسترخوان پر بیٹھے ہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

"کارگہِ حیات کا تمام نظم و نسق سعی و عمل پر چل رہا ہے اور یہ دیکھنے کیلئے کہ یہ مساعی و اعمال صحیح نتائج بھی مرتب کر رہے ہیں یا نہیں، ان کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اس کا نام محاسبۂ نفس ہے۔ جو راہرو یہ نہیں دیکھتا کہ اس نے کسقدر مسافت طے کرلی ہے اور باقی راستہ کتنا رہ گیا ہے اسے منزل تک پہنچنے کی حتمی امید نہیں رکھنی چاہیئے اسلئے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی دوراہے پر وہ غلط موڑ مڑ گیا ہو اور اس کے بعد وہ ہر چند چلا جارہا ہو لیکن اسے اس کا احساس تک بھی نہ ہو کہ اس کا ہر قدم اسے منزل سے دور سے دور تر کرتا چلا جارہا ہے۔ جو مریض مقیاس الحرارت کی جدول مرتب نہیں کرتا وہ کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا علاج صحیح ہو رہا ہے یا نہیں۔ جو دکاندار کبھی اپنا بہی کھاتہ نہیں ملاتا اور وقتاً فوقتاً اپنا (stock Taking) نہیں کرتا وہ کبھی محسوس نہیں کرسکتا کہ اس کی تجارت نفع مند ہے یا اسے خسارہ کی طرف لئے جارہی ہے۔ پھر جب انفرادی زندگی میں محاسبۂ نفس یا جائزۂ اعمال کی اسقدر ضرورت ہو تو ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی میں یہ ضرورت اور بھی اہم و اشد ہو جاتی ہے۔ جو قوم یہ نہیں دیکھتی کہ بساطِ سیاست پر اس سے کون سی چال غلط چلی گئی، اسے بازی جیتنے کی بہت کم توقع رکھنی چاہیئے۔ جو اس کا اندازہ نہیں کرتی کہ فلاں دوراہے پر اس کا قدم کس طرف اٹھ گیا وہ جہانِ مسابقت و دنیائے منافست میں امامت و قیادت کی امیدوار نہیں ہوسکتی۔ یہی وہ جائزہ و موازنہ اور محاسبہ و مقابلہ ہے جسے بالفاظِ دگر تنقید کہتے ہیں۔ متاعِ زندگی کی صحیح پرکھ محکِّ نقد و نظر پر ہی ہوسکتی ہے۔ جو اپنی تنقید آپ کرلیتا ہے اسے پھر کسی دوسرے کی تنقید سے ڈرنے اور جھجکنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اپنے مال کی قیمت کو خوب جانتا ہے اسلئے وہ اسے دنیائے بیع و شری کی ہر منڈی میں بلا تردد و تامل پیش کردیتا ہے لیکن جو قوم تنقیدِ اعمال کو برداشت نہیں کرتی وہ ہمیشہ دوسروں کے مقابلہ میں آنے سے گھبراتی اور خوف کھاتی ہے۔ اسلئے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتی۔"

(طلوعِ اسلام ص ۶۳ مارچ ۴۸ء)

تشکیلِ پاکستان کی چھٹی سالگرہ پندرہ اگست کو آرہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی قوم کی زندگی میں وہ دن سب سے بڑا سعید اور تابندہ ہوتا ہے جس دن اس قوم کو آزادی حاصل ہوئی ہو (اگرچہ مختلف قوموں کے نزدیک آزادی کا مفہوم مختلف ہے) اس قسم کی تقریبات جشن و مسرت کی تقریبات ہوتی ہیں لیکن ہمارے نزدیک جشن و مسرت کے ساتھ ساتھ محاسبۂ نفس بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس میں کہا گیا ہے — جو قوم وقتاً فوقتاً محاسبۂ نفس کیلئے نہیں رکتی وہ کبھی نہیں کہہ سکتی کہ وہ منزل — قریب آرہی ہے یا اس کا ہر قدم اسے اپنے نصب العین سے دور لئے جارہا ہے —

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جسقدر کوئی شے زیادہ عزیز ہوتی ہے اسی قدر اس کے متعلق محاسبہ بھی زیادہ باریک بینی اور شدت کے ساتھ

کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام کے نزدیک پاکستان اس کی آرزوؤں کا محور، اس کی تمناؤں کا مرکز، اور اس کی دعاؤں کا مقصود ہے اسلئے کہ اس کے نزدیک یہی وہ سرزمین ہے جہاں قرآنی نظام ربوبیت کے قیام کی توقعات ہیں۔ اسلئے مملکت پاکستان کے متعلق طلوع اسلام کا محاسبہ بھی بہت عمیق اور شدید ہوتا ہے۔

طلوع اسلام ہمیشہ حقائق کا کھلے بندوں سامنا کرتا ہے اور ان پر پردہ ڈال کر نہ فریب نفس میں مبتلا ہوتا ہے نہ ابلہ فریبی کے جرم کا مرتکب۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت مملکت پاکستان کے کسی گوشے میں کوئی شے ویسی نہیں ہے جیسا اسے ہونا چاہیئے۔ قرآن نے ایک بگڑے ہوئے معاشرہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی تھی کہ ۔۔ ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس ۔۔ اس میں زندگی کے ہر گوشہ میں ناہمواریاں پیدا ہوجاتی ہیں اور ان ناہمواریوں کی وجہ لوگوں کی اپنی کرتوتیں ہوتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ پاکستانی معاشرہ کی ناہمواریوں کی تصویر اس سے زیادہ جامع الفاظ میں نہیں کھینچی جاسکتی۔ لیکن ہمارے پیش نظر اس تصویر کے خط وخال کو اجاگر کرنا نہیں۔ ہمارے سامنے اس آیت کا دوسرا حصہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ ناہمواریاں لوگوں کی اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے ہاتھ ہیں جو ان ناہمواریوں کو پیدا کرنے والے ہیں اسلئے کہ جب تک مرض کی تشخیص نہ ہوجائے اس کا علاج ناممکن ہوتا ہے۔

ان اسباب کے دریافت کرنے کیلئے آپ کو کچھ دور پیچھے جانا پڑے گا یعنی اس دور میں جب پاکستان کے حصول کیلئے جدوجہد ہو رہی تھی اس زمانہ میں آپ کے سامنے دو گروہ نمایاں طور پر آئیں گے۔ ایک گروہ تشکیل پاکستان کی تائید میں تھا اور دوسرا گروہ اس کی مخالفت کر رہا تھا اس دور کی سیاسی وجوہات کے باعث تائید کرنے والے گروہ میں بیشتر حصہ ان لوگوں کا تھا جن میں ذاتی صلاحیتوں کے مقابلہ میں موروثی دولت کا "جوہر" زیادہ تھا۔ مخالفین کے گروہ میں مولویوں کا طبقہ پیش پیش تھا۔ آپ طلوع اسلام کے ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک کے فائل اٹھا کر دیکھیئے، آپ کو نظر آئے گا کہ مولویوں کی مخالفت کا ایک سیلاب تھا جو تحریک پاکستان کے خلاف چاروں طرف سے امنڈے چلا آرہا تھا اور طلوع اسلام قرآنی روشنی کے مینار کی طرح ان تھپیڑوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ مخالفین کے اس گروہ میں ایک طبقہ تو وہ تھا جنھیں نیشلسٹ علماء کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کو بربنائے مذہب ایک جداگانہ قوم تسلیم کرنے کے اصول کے خلاف تھے اور اسی بنا پر پاکستان کے مطالبہ کے خلاف۔ اس گروہ کا مقابلہ اس لئے دشوار نہ تھا کہ وہ اپنے حربوں کو کھلا لیکر سامنے آتے تھے لیکن انہی میں کا ایک دوسرا گروہ تھا جو ایک طرف متحدہ قومیت کا بھی مخالف تھا لیکن دوسری طرف حصول پاکستان کے بھی خلاف تھا۔ یہ گروہ اگرچہ تعداد میں بہت کم تھا لیکن پاکستان دشمنی کے اعتبار سے زیادہ خطرناک تھا، اسلئے کہ یہ لوگ کھلے بندوں سامنے آنے کی بجائے آستین میں دشنۂ پنہاں لیکر معانقہ کیلئے آگے بڑھتے تھے۔ اس گروہ کا نام اسلامی جماعت تھا۔ طلوع اسلام نے اس محاذ کا بھی مقابلہ کیا۔ لیکن چونکہ بعض وجوہات کی بنا پر اس کی اشاعت ۱۹۴۲ء میں ملتوی ہوگئی اسلئے اس جماعت کو اپنی زہرافشانی کیلئے زیادہ موقع مل گیا۔ یہی وہ جماعت ہے جو اپنے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کو "شریعت" کے مقدس رومالوں میں لپیٹے پاکستان میں پہنچی۔ چونکہ ان ناہمواریوں میں جن کی طرف ہم اوپر اشارہ کرچکے ہیں اور جو پاکستان کی موجودہ حالت کا بنیادی سبب ہیں۔ اس جماعت کا ہاتھ پیش پیش ہے اسلئے طلوع اسلام پہلے دن سے قوم کو ان کے خطرہ سے آگاہ کئے چلا آتا ہے۔ اور جبتک اس کے دم میں دم ہے وہ اس خطرہ کی گھنٹی کو برابر بجائے چلا جائے گا۔

کسی تحریک کا مطالعہ کرنے کیلئے اس کے داعی کی نفسیات کا مطالعہ نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خود نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے یہ کہلوا دیا کہ فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ افلا تعقلون۔ میں نے تمہارے اندر اپنی ساری عمر بسر کی ہے۔ میں پیدائش سے لیکر اس دعوائے رسالت تک تمہارے پاس ہی رہا ہوں۔ کیا تم میری زندگی سے اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میری اس دعوت کے محرکات کیا ہیں۔ واضح رہے کہ اس مطالعہ سے مقصود کسی کی "پرائیویٹ زندگی" کے اندر جھانکنا نہیں ہوتا بلکہ ان رجحانات و عوائف کا متعین کرنا ہوتا ہے جو اس کی تحریک کے ستون بنتے ہیں۔ اسلامی جماعت کی تحریک کے داعی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی زندگی کے حالات پچھلے دنوں اس جماعت کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں بعض ٹکڑے ایسے ملتے ہیں جن سے ان کے نفسیاتی رجحانات کا صاف صاف پتہ چل جاتا ہے اور جو یہ متعین کر دیتے ہیں کہ اس تحریک سے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) ان کا مقصد کیا ہے۔ مودودی صاحب اپنے بچپن کے حالات کے متعلق لکھتے ہیں کہ

مجھے سب سے زیادہ لطف اس وقت آتا تھا جب میں بیمار ہوتا تھا۔ جب مجھے کوئی چوٹ لگ جاتی تھی اور میرے والدین میرے لئے پریشان ہوتے تھے۔ اسی لطف کی خاطر میں اپنے آپ کو کبھی جان بوجھ کر بھی خطرہ میں ڈالتا تھا۔ (چراغِ راہ جولائی ۱۹۵۳ء)

جن سطح بین حضرات کے نزدیک اس قسم کے واقعات محض بچوں کی باتیں ہوتے ہیں جن سے انسان دل بہلا سکتا ہے وہ تو اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے لیکن جن حضرات کو علم النفس (Psychology) سے کچھ دلچسپی ہے وہ جانتے ہیں کہ بچپن کی یہی خصوصیات وہ بنیادیں ہوتی ہیں جن پر انسان کے کیریکٹر کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔ آپ علم تجزیہ نفس (Psycho-Analysis) کے ماہرین کی کتابوں میں دیکھئے یا اگر آپ کے قریب کوئی ایسے صاحب ہوں تو ان سے پوچھئے کہ جس بچہ میں وہ نفسیاتی رجحان موجود ہو جس کا ذکر مودودی صاحب نے کیا ہے اس کی سیرت کی نمایاں خصوصیت کیا ہوا کرتی ہے۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ سائیکالوجی کی رو سے بچہ میں اس رجحان کا نام (Self-display) ہوتا ہے اور اس رجحان والے انسان کی ہمیشہ خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی توجہات کا مرکز بنا رہے اور اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام کا مالک بن جائے۔ وہ جس طرح بچپن میں اپنے گھر والوں کی توجہات کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے جان بوجھ کر خطرہ مول لے لیتا ہے اسی طرح بڑا ہو کر اپنے اس نفسیاتی تقاضے کی تسکین کیلئے ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔

مودودی صاحب نے اپنے بچپن کے حالات کے متعلق ایک چیز اور بھی لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرے ایک بھائی مجھ سے تین چار برس بڑے تھے۔ مجھے کھانے کی جو چیز ملتی تھی اسے میں فوراً کھا لیتا تھا مگر بھائی سنبھال کر کسی اچھے وقت پر کھانے کیلئے اٹھا رکھتے تھے۔ اسی طرح جو پیسے ملتے تھے ان کو بھی فوراً خرچ کر ڈالتا تھا اور بھائی صاحب انہیں جمع کر کے کوئی اچھی چیز خرید لاتے تھے۔ بس یہ میرے اور ان کے درمیان جھگڑے کی مستقل بنیاد تھی۔ میں ہمیشہ ان کے حصہ میں سے اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ تھوڑی دیر مقابلہ کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے اس طرح والدین کے حصہ میں سے میں پچھتر فی صدی کا مالک ہوتا تھا پچاس فی صدی اپنے حساب میں اور پچیس فیصدی بڑے بھائی کے حساب میں سے۔ (ایضاً)

اس کردار کے بچے کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بڑا ہو کر کبھی اس مقام سے مطمئن نہیں ہوتا جو اسے معاشرہ میں اس کی ذاتی قابلیت کی بنا پر ملتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس کی کوشش کرتا ہے کہ جو بلند مقامات دوسروں کو حاصل ہیں وہ بھی اس کے قبضے میں آجائیں۔

مودودی صاحب کے متعلق چراغ راہ بابت جون ۱۹۵۳ء میں لکھا ہے کہ

> مولانا کا لکھنے پڑھنے میں بھی ایک خاص ذوق ہے وہ ہر چیز اعلیٰ درجہ کی رکھتے ہیں۔ کاغذ، قلم، پنسل، فرنیچر، الماریاں، کتابیں۔ غرضیکہ نفاست یہاں بھی پوری طرح موجود ہے۔ چنانچہ بعض دقیانوسی قسم کے لوگ ان کی اس عادت کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ یہ علماء کی خصوصیات نہیں رکھتے۔

نفاست پسندی اور حسن ذوق قابل ستائش جوہر ہیں لیکن نفاست اور شے ہے اور "ہر چیز اعلیٰ درجہ کی رکھنا" اور شے۔ نفسیاتی طور پر اسکی تہ میں بھی وہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے جسے اوپر (Self - display) کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جس کا تقاضا اپنے آپ کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس رجحان کا انسان کبھی غریبی میں گذارہ نہیں کر سکتا۔

یہ ہیں مودودی صاحب کے وہ نفسیاتی رجحانات جن کا علم خود ان کی اپنی تحریروں سے ہوتا ہے۔ ان کے قیام حیدرآباد کے دوران میں جب نیشنلسٹ علماء کا طبقہ متحدہ قومیت (نیشنلزم) کی تحریک کو آگے بڑھا رہا تھا۔ مودودی صاحب نے متحدہ قومیت کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ اور اس طرح انہیں سیاسی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہو گئی۔ لیکن وہاں وہ مالی مشکلات سے بیحد پریشان تھے۔ ترجمان القرآن کی اشاعت چھ سو کے قریب تھی جس میں سے تین سو ریاست خریدتی تھی اور تین سو عام خریدار۔ ریاست نے اپنی خریداری بند کر دی تو باقی تین سو خریدار رہ گئے۔ جن کا مجموعی چندہ اٹھارہ سو روپیہ سالانہ ہوتا تھا اس اٹھارہ سو میں سال بھر کے بارہ پرچے شائع کرنا ہی ناممکن تھا چہ جائیکہ اس سے مودودی صاحب اپنے گذارے کی صورت پیدا کر سکتے۔ ایک عطارہ کی چھوٹی سی دکان میں مودودی صاحب کا کچھ حصہ تھا اور یہی کچھ ان کے معاش کا آسرا تھا لیکن اسکی آمدنی بہت قلیل تھی (یہ تمام باتیں مودودی صاحب اس زمانے میں خود بیان فرمایا کرتے تھے) ہمارے نزدیک غریب ہونا کوئی جرم نہیں۔ لیکن ان کی زندگی کے جو حالات ان کی جماعت کے جرائد و رسائل میں شائع ہوئے ہیں (چاہے وہ ان کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے ہوں یا دوسروں کی طرف سے) ان میں ان باتوں کا کوئی تذکرہ نہیں۔ ان معاشی مجبوریوں کی وجہ سے انہوں نے حیدرآباد کو چھوڑ کر شمالی ہند کا رخ کیا۔ یہاں آکر وہ دارالاسلام (پٹھان کوٹ) میں کس طرح پہنچے اور کس طرح وہاں سے نکلے۔ ہمیں ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہاں ان کے اندر جو تبدیلی واقع ہوئی اس کا بیان کرنا ضروری ہے۔ دارالاسلام پہنچکر انھیں معاشی پریشانیوں کی طرف سے فراغت نصیب ہو گئی تو ان کا وہ جذبہ پھر ابھرا جس کا تقاضہ اپنے لئے ایک نمایاں مقام حاصل کرنا تھا۔ اس وقت ان کی ظاہر ہیئت بالکل ایسی ہی تھی جیسی مسلم لیگ کے اکابر (مثلاً لیاقت علی خاں مرحوم وغیرہ) کی تھی۔ سر پر انگریزی بال۔ ڈاڑھی بالکل صاف۔ سر سے پاؤں تک مولویت کا کوئی نشان تک بھی نہیں تھا۔ انھوں نے پہلے سر کے بالوں کو پٹھوں میں تبدیل کیا۔ ڈاڑھی بڑھائی۔ لبیں ترشوائیں اور اس کے بعد مسلم لیگ قیادت کے خلاف یہ آواز بلند کرنی شروع کی کہ یہ لوگ مغربی فیشن کے دلدادہ اور فرنگیانہ اسٹائل کے پرستار ہیں اسلئے ان سے اسلام کی بہبودی کی توقع کرنا خیال خام ہے۔ اس آواز پر وہ لوگ ان کی طرف کھنچنے شروع ہو گئے جو سمعی مذہبیت کو سب سے بڑا

تقویٰ اور خاص انداز کی شکل و شباہت کو جنت کی کنجی خیال کرتے ہیں۔ اس طرح اسلامی جماعت کی بنیاد پڑی اور مودودی صاحب نے اپنی مرکزی حیثیت کو بلند کرنے اور لیگ کی قیادت کو ذلیل کرنے کی مہم جاری کر دی۔ لیگ کی قیادت کی مخالفت ناممکن تھی جبتک خود پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت نہ کی جاتی کیونکہ اسوقت جناح اور پاکستان لازم و ملزوم ہو چکے تھے۔ چنانچہ مودودی صاحب نے علانیہ لکھنا شروع کر دیا کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔

اور یہ بھی کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو۔

جب ان سے کہا جاتا کہ پاکستان کی سرزمین حاصل ہو جائے تو اسکے بعد کوشش کر لی جائیگی کہ اسے اسلامی مملکت بنا دیا جائے۔ اسکے جواب میں وہ کہتے کہ

> بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اسکو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اسکی بنا پر میں اسکو ناممکن سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اسکو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ [1]

مودودی صاحب اور ان کی جماعت پاکستان کی مخالفت کے "جہادِ عظیم" میں مسلسل مصروف رہی لیکن جب انکی مذموم کوششوں کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا تو یہ پوری ڈھٹائی سے پاکستان میں آ دھمکے اور ہندوستان کی طرف رخ نہیں کیا۔ اسکی وجہ ظاہر ہے۔ ہندوستان میں مذہب کے نام پر اس تحریک کو چلا کر حکومت کی کرسیوں کا حاصل کرنا ناممکن تھا۔ نہ وہاں انھیں معاشی سہولتیں میسر آ سکتی تھیں۔ اس کا تجربہ انھیں حیدرآباد میں ہو چکا تھا۔ اسکے برعکس پاکستان کی زمین ان کیلئے بہت ہی سازگار ہو سکتی تھی چنانچہ یہاں پہنچکر انھوں نے اپنی قیادت کا علم بلند کرنے کیلئے طرح طرح کی اسکیمیں بنانا شروع کیں۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، مسلم لیگ کے حامیوں میں اکثریت انکی تھی جن کی پوزیشن کا مدار ذاتی جوہروں سے زیادہ موروثی دولت پر تھا۔ ظاہر ہے کہ انقلاب کے بعد پہلے پہل اقتدار انہی کے ہاتھوں میں آنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جن حالات میں ہندوستان کی تقسیم ہوئی تھی وہ اچھی سے اچھی مستحکم حکومتوں میں تزلزل پیدا کر دینے کیلئے کافی تھی چہ جائیکہ ایک ایسی حکومت جو ابھی وجود ہی میں نہیں آئی تھی اس پر ان لوگوں کی فرنگیانہ وضع قطع۔ مودودی صاحب نے ان تمام حالات سے فائدہ اٹھایا اور اپنی قیادت کو آگے بڑھانا شروع کیا جس کے بغیر ان کی سیرت کا نفسیاتی تقاضہ کسی طرح پورا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ جس شخص کے نفسیاتی رجحانات یہ ہوں کہ وہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں مرکزِ توجہ بننے کیلئے اپنے آپ کو جان بوجھکر خطرہ میں ڈالدے وہ اپنی قیادت قائم کرنے کیلئے کیا کچھ نہیں کریگا۔ اور جو شخص لڑ جھگڑ کر پچھتر فیصدی حصہ پر قابض ہونے کا عادی ہو وہ جمہوری نظام حکومت میں اپنی اکثریت قائم کرنے کے خیال کو کس طرح چھوڑ سکتا تھا؟ پھر جو شخص اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی چیزیں رکھنے کا شائق ہو اور اس کے پاس حصولِ معاش کا اور کوئی ذریعہ نہ ہو وہ اس قسم کے ذرائع معاش کو کس طرح ترک کر سکتا تھا جس میں "مَن" بھی برسے اور لوگ ہاتھ بھی چومیں۔

مسلمان کے دل کی گہرائیوں میں مذہب سے محبت ہے۔ ان کا بیشتر حصہ مذہب کے نام پر بڑی سے بڑی قربانی کر دینے پر بلا تامل آمادہ ہو جاتا ہے وہ مذہب کے ایک خاص تصور کو حقیقی اسلام سمجھتے ہیں۔ مودودی صاحب نے ان کے سامنے وہی اسلام پیش کیا۔ اس طرح سے یہ طبقہ نہایت نیک نیتی سے ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ یہ ہے وہ طاقت جس کی بنا پر مودودی صاحب اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین اور کم از کم پچھتر فیصدی حصہ حاصل کرنے کے

[1] مندرجہ بالا اقتباسات کیلئے دیکھئے ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۳۹ء، مئی جون، اگست اور دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء۔

جذبہ کی تسکین اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں خریدنے کے ذوق کی پرورش کا سامان فراہم کئے چلے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کا یہ مخلص اور نیک نیت مذہب پرست طبقہ یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ اللہ کے راستہ میں جہاد کر رہے ہیں۔

مودودی صاحب کی ہوس "انا الموجود لاغیری" کی کیفیت یہ ہے کہ وہ صرف مغرب زدہ طبقہ کے مقابلہ میں اپنی قیادت پر ہی قانع نہیں بلکہ خود مولویوں کے حلقہ میں بھی اپنے آپ کو ان میں کا ایک سمجھنے پر راضی نہیں ہوتے۔ پہلے تو انھوں نے کبھی کسی مولوی کو منہ نہیں لگایا جبتک اس نے ان کے ہاتھ پر بیعت امارت نہیں کر لی لیکن جب بعض سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے انہیں اکتیس ۳۱ علماء کی جماعت میں شامل ہونا پڑا تو ادھر ان کی طرف سے مرتب کردہ دستوری سفارشات پر دستخط کئے اور ادھر اپنی طرف سے آٹھ نکاتی منشور الگ شائع کر دیا اور اپنی جماعت سے یہ کہا کہ وہ اس آٹھ نکاتی (جسے بعد میں نو نکاتی بنا دیا گیا تھا) منشور کے مطالبہ کیلئے حکومت کو چٹھیاں لکھیں اور رزولیوشن پاس کریں۔ یعنی اس میں بھی اپنی ہی قیادت کو آگے بڑھایا۔

ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ مودودی صاحب کے ارادت مندوں کے حلقہ کو یقیناً ناگوار گذریگا اسلئے کہ وہ تو انھیں (فاران کے بیان کے مطابق) امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے کم درجے پر نہیں سمجھتے لیکن ہم ان حضرات سے جو حقائق کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں عرض کرینگے کہ وہ بغور دیکھیں کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بات حقیقت کے خلاف بھی ہے؟ دنیا کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ بعض افراد اپنے مخصوص جذبات کی تسکین کیلئے کس طرح قوم کی قوم کو تباہ و برباد کرا دیتے ہیں۔ بعینہٖ یہی کچھ پاکستان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ارباب حل و عقد میں صلاحیتوں کی پہلے ہی کمی تھی اس پر ان لوگوں نے مذہب کے نام پر مسلسل چھ برس سے ملک میں اسقدر ہڑبونگ مچا رکھی ہے کہ کئی موقعوں پر ارباب نظم و نسق بوکھلا گئے ہیں[1]۔ ایک ایسا ملک جس کی آبادی کا بیشتر حصہ جذباتی ہو اور وہ مذہب کے نام پر بلا سوچے سمجھے سب کچھ کر دینے پر آمادہ ہو جاتا ہو۔ اس ملک میں لوگوں کے جذبات کو (Exploit) کرنے والے عناصر بڑی آسانی سے تخریب پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار اس خلفشار کے حریف نہیں ہو سکے جو مذہب کے نقاب میں عوام کی نیک نیتوں کو (Exploit) کر کے ملک میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس خلفشار نے انہیں اسکی فرصت ہی نہیں دی کہ جو تھوڑی بہت صلاحیتیں ان میں تھیں انھیں کسی مفید مقصد میں صرف کیا جائے اور نہ ہی ملک کو اسکی فرصت دی ہے کہ وہ اطمینان سے بیٹھکر سوچیں کہ اچھی صلاحیتوں کو ابھار کر کس طرح بروئے کار لایا جا سکتا ہے جس سے ملک کی ناہمواریاں ہمواریوں میں تبدیل ہو جائیں۔ اسوقت ہمارا ملک جن حالات سے گذر رہا ہے ان میں ہماری بے بسی کا یہ عالم ہو چکا ہے کہ

جہاز عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں　　سوار خاک ہیں، بے اختیار بیٹھے ہیں

اس طرح بے اختیار اور بدحواس کہ —— نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں —— ہماری ان بے بسیوں اور بیچارگیوں کا عجیب وغریب دولابی چکر (Vicious circle) بن جاتا ہے۔ مثلاً ملک کی حالت اسلئے خراب ہے کہ ہمارے پاس خوراک کی کمی ہے۔ خوراک کی کمی اسلئے ہے کہ ہماری نہروں میں پانی نہیں آتا۔ نہروں میں پانی اسلئے نہیں آتا کہ ہمارے دریا کشمیر سے نکلتے ہیں اور کشمیر پر ہندوؤں کا قبضہ ہے۔ کشمیر پر ہندوؤں کا قبضہ اسلئے ہے کہ ہم کمزور ہیں اور ہم کمزور اسلئے ہیں کہ ملک کی حالت خراب ہے —— یا مثلاً —— ملک کی انتظامی حالت اسلئے خراب ہے کہ انتظام کرنیوالے اہل کار بددیانت ہیں۔ اور اہلکار اسلئے بددیانت ہیں کہ ملک کا انتظام ٹھیک نہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔

لیکن اگر آپ ٹھنڈے دل سے غور کرینگے تو یہ حقیقت آپکے سامنے آجائیگی کہ ان بیچارگیوں میں سے بیشتر ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔ ہم نے اسوقت تک

---

[1] یہی کچھ انڈونیشیا کی نوزائیدہ مملکت میں وہاں کی "اسلامی جماعت" (دارالسلام والے اور مصومی پارٹی) کر رہی ہے۔ چنانچہ اب وہاں صورت حالات یہانتک پہنچ چکی ہے کہ ملک میں حکومت ہی قائم نہیں ہوتی! یہی کچھ یہاں کی "اسلامی جماعت" چاہتی ہے۔

کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جس سے پورے ملک کے سامنے ایک مشترکہ نصب العین آجائے۔ اسکے برعکس ہم نے ہر ممکن طریقے سے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ سب سے پہلی تفریق بنگالی اور غیر بنگالی کی ہے۔ یہ ایسی گہری تفریق ہے کہ ہم کسی مسئلہ کا حل آل پاکستان سطح پر کر ہی نہیں سکتے پھر مغربی پاکستان میں سندھی، پنجابی، سرحدی، بلوچی وغیرہ کی تفریقات ایسی ہیں کہ ہم اس حصہ ملک میں بھی ایک وحدت قائم نہیں کر سکتے۔ پھر ایک صوبہ میں بھی مسلم لیگی، غیر مسلم لیگی تفریقات ایسی ہیں جنھوں نے بھائی کو بھائی کا دشمن بنا رکھا ہے۔ اس کے نیچے اتریئے تو میونسپل کمیٹیوں اور لوکل بورڈوں میں راجپوتوں، سیدوں، شیخوں، پٹھانوں کی تفریقات کے علاوہ مہاجروں اور غیر مہاجروں کی تفریقات بھی شامل ہیں۔ معاشی تفریقات اور مذہبی تفریقات ان سے الگ ہیں۔ سوچئے کہ جو ملک اپنے اندر اس طرح سے بٹ رہا ہو اس میں طاقت کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے اور خوشحالی کیسے آسکتی ہے؟

بعض حساس طبائع نے اس عالمگیر خرابی کا علاج افراد کی تبدیلی میں سمجھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ افراد کی تبدیلیاں تھوڑی بہت اصلاح کا موجب ہو جاتی ہیں لیکن جن حالات سے ہم گذر رہے ہیں ان کا علاج افراد کی تبدیلیوں سے ممکن نہیں۔ ان کا علاج پورے کے پورے نظام کی تبدیلی سے ہو سکتا ہے۔ اور نظام بھی وہ جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔ اس نظام کے بنیادی خط و خال کئی بار دہرائے جا چکے ہیں حتیٰ کہ اس کا تفصیلی خاکہ اس مسودۂ دستور میں پیش کیا جا چکا ہے جسے دو سال قبل مجلس دستور ساز کے پاس بھیجا گیا تھا اور جو الگ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس نظام کی رو سے

(۱) قوم کو مُلّا کی قطعاً ضرورت نہیں رہتی (مُلّا کی انسٹی ٹیوشن ہی غیر اسلامی اور عجم کی پیداوار ہے) قرآنی نظام میں قوم کے نمائندگان اپنے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں ملک کے قوانین خود مرتب کرتے ہیں۔

(۲) سرمایہ داری، زمینداری، کارخانہ داری غرضیکہ ہر قسم کی انفرادی مفاد پرستیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اسلئے کہ قرآن کی رو سے ذرائع پیداوار ملت کی اجتماعی تحویل میں رہتے ہیں کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں رہتے اور ملت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام افراد کی ضروریات زندگی فراہم کرے، اور ان کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کے سامان مہیا کرے۔

(۳) تمام صوبجاتی، نسلی، مذہبی فرقہ پرستی اور طبقاتی تفریقات مٹ جاتی ہیں کیونکہ قرآن کی رو سے ہر فرزند آدم یکساں توجہ کا مستحق ہے اور مقصود انسانیت احترام آدمیت ہے۔

(۴) اقتدار اور اختیار میں کسی پارٹی کی اجارہ داری نہیں رہتی کیونکہ پارٹیوں کا وجود قرآن کی رو سے شرک ہے۔

اسی کا نام قرآنی نظام ہے اور اسی کو "نظام شریعت" کہتے ہیں اسی کا نام تعمیل احکام خداوندی اور اتباع سنت رسول اللہ ہے کیونکہ رسول اللہ صلعم نے خود اسی طرح سے قرآنی نظام کو متشکل کیا تھا۔ پاکستان میں جو حساس افراد یہ چاہتے ہیں کہ ملک کی خرابیاں دور ہو جائیں اور اس کا مستقبل درخشندہ ہو۔ نیز وہ لوگ جنکی آرزو یہ ہے کہ ملک کا نظام اللہ کے قانون کے مطابق ہو، ان کیلئے کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ایک مرکز پر جمع ہوں اور خالص قرآنی نظام ربوبیت کو سامنے رکھکر سوچیں کہ اسے کس طرح عمل میں لانا چاہیئے۔ اس کے سوا نہ آپ کی داخلی خرابیوں کا کوئی حل ہے اور نہ خارجی خطرات سے نجات کی کوئی صورت — طلوع اسلام اسی قرآنی نظام کی طرف دعوت دیتا چلا آرہا ہے اور اسی نظام کا نقیب بنکر زندہ رہنے کی اسے آرزو ہے۔

معذرت: نہایت افسوس ہے کہ اس شمارہ میں محترم پرویز صاحب کا "سلیم کے نام خط" شائع نہیں ہو رہا۔ وہ کتابت شدہ رکھا ہے لیکن پرچہ کی تنگ دامنی اس کیلئے گنجائش نہیں پیدا کر سکی۔ اسی طرح علامہ تمنا صاحب کی مسلسل کتاب "اعجاز القرآن" کی قسط بھی شائع نہیں ہو رہی۔

حلقۂ معاونین طلوعِ اسلام

طلوع اسلام کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۵۳ء میں ان ستائیس حضرات کے اسمائے گرامی شائع ہو چکے ہیں جنھوں نے ہماری دعوت پر لبیک کہا اور معاونین کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد جو دیگر احباب حلقۂ معاونین میں (۲۲ جولائی تک) شامل ہوئے ہیں ان کے اسمائے گرامی شکریہ کے ساتھ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ معاونین کی کل تعداد اسوقت تک چھیاسٹھ (۶۶) ہوئی ہے جو حضرات ابھی تک اس حلقہ میں شامل نہیں ہوئے وہ خود سوچیں کہ قرآنی فکر اور نظام کی اشاعت کی کتنی بڑی اسکیم اس قلیل سی رقم کے ساتھ کس حد تک آگے بڑھ سکے گی۔ اسکیم یہ ہے کہ آپ ایکسو روپیہ کی رقم (یکمشت یا چار مساوی اقساط میں) ارسال فرمادیں۔ آپ کو رسالہ طلوع اسلام اور ادارہ کی طرف سے شائع ہونیوالی تمام کتابیں اسوقت تک بلا قیمت پیش کی جاتی رہیں گی جبتک آپ کی سو روپے کی رقم پوری نہ ہو جائے۔ اگر خدانخواستہ یہ سلسلہ بند کردینا پڑا تو آپ کی بقایا رقم واپس کردی جائیگی۔ ہمیں کم از کم اس قسم کے ایک ہزار معاونین کی ضرورت ہے۔ توقف نہ کیجئے۔ آپ کو کسی قسم کا بھی خسارہ نہیں ہوگا اور آپ کی مدد سے قرآنی فکر اور نظام کی اشاعت کا انتظام ہو جائے گا۔

فہرست معاونین خصوصی طلوع اسلام

خوشاب ضلع سرگودھا۔ (۲۸) چودھری نیاز علی صاحب۔ گنپت بلڈنگ۔

مردان۔ (۲۹) ڈاکٹر انور علی خانصاحب۔ بنک روڈ مردان

(۳۰) ایچ ایم خانصاحب 〃

(۳۱) ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب 〃 〃

(۳۲) محمد خیر اللہ صاحب۔ چیئرمین بازار شیداں 〃

(۳۳) ڈاکٹر آر ایم خانصاحب۔ ڈنٹیسٹ ہوتی بازار 〃

(۳۴) ڈاکٹر عبدالغفار صاحب۔ عامل 〃 〃

(۳۵) محمد اکرم صاحب ٹھیکیدار بکٹ گنج 〃

(۳۶) ڈاکٹر ٹی ایم خانصاحب 〃

(۳۷) ملک محمد افضل صاحب 〃

(۳۸) جناب اکبر علی خانصاحب 〃

(۳۹) مستری محمود علی صاحب شام گنج 〃

مردان۔ (۴۰) فضل کریم مہاجر صاحب بکٹ گنج مردان

(۴۱) محمد یعقوب خانصاحب۔ ٹھیکیدار 〃 〃

(۴۲) شیخ محمد حسن صاحب۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس 〃

(۴۳) غلام قادر خانصاحب سٹورکیپر صوابی۔ ضلع مردان

(۴۴) ڈاکٹر محمد فضل خالق صاحب۔ چارباغ 〃 〃

لاھور (۴۵) ڈاکٹر حبیب اللہ صاحب آری گیشن ورکشاپ ڈسپنسری مغلپورہ۔ لاہور

(۴۶) میاں عبدالقادر مظفر صاحب معرفت چودھری بشارت احمد صاحب۔ 〃

(۴۷) مقبول احمد صاحب۔ ۱۲۹ جیکب روڈ این ڈبلیو آر کالونی 〃

لائلپور (۴۸) احمد حسین خانصاحب جینوٹ بازار گلی ۸ ایف بلاک۔ لائلپور

گجرات (۴۹) حکیم محمد حسین صاحب فیض الٰہی منزل ۔ سول لائن گجرات
منٹگمری (۵۰) رانا حفیظ صاحب ۔ ڈاکخانہ تبولہ
براستہ عارف والہ ۔ ضلع منٹگمری
(۵۱) رشید احمد صاحب چک ۸۹/۹۔۱۰ ڈاکخانہ خاص براستہ منٹگمری
(۵۲) زبیر عزیز صاحب ۔ پاکستان نیشنل اسٹور ۔ اوکاڑہ ۔ ضلع "
شیخوپورہ (۵۳) عبدالکریم صاحب پروفیشنل ٹیکس انسپکٹر
ننکانہ صاحب ۔ ضلع شیخوپورہ
ایبٹ آباد (۵۴) شیر علی خانصاحب ۔ سی ۔ ایم ایچ ۔ ایس ایچ او ۔
اے ایم آئی ۔ ایبٹ آباد
کوئٹہ (۵۵) ایک صاحب جو اپنا نام شائع کرانا نہیں چاہتے ۔
کراچی (۵۶) پیرزادہ رضوان الحسن صاحب ۵ جیکب لائن ۔ کراچی
(۵۷) جناب فضل الرحمٰن صاحب ۔ ایشیاٹک ڈیکل کمپنی ۲۳ وکٹوریہ روڈ کراچی

کراچی (۵۸) ایک اور صاحب جو اپنا نام شائع کرانا نہیں چاہتے ۔
سیالکوٹ (۵۹) شیخ عبدالغنی صاحب قریشی ۔ چھتی شیخاں ۔ سیالکوٹ
(۶۰) ایم اظہار خانصاحب صدر "
(۶۱) عبدالرحمٰن صاحب مراد ۔ اسلام آباد ۔ "
راولپنڈی (۶۲) مقبول محمود فرحت صاحب
مقبول اسٹیشنری مارٹ ۔ ٹرنک بازار ۔ راولپنڈی
(۶۳) نیاز محمد صاحب مکان ۴۸۲ ڈھوک الٰہی بخش "
پشاور (۶۴) ڈاکٹر یوسف علی صاحب
معرفت پشاور میڈیکل ہال ۔ بازار کلاں ۔ پشاور شہر
میرپور خاص (۶۵) بشیر احمد صاحب سوی ۔ ریلوے کالونی ۔ میرپور خاص سندھ
مظفرگڑھ (۶۶) غلام محی الدین صاحب ۔ مظفرگڑھ

خدارا توجہ فرمائیں

اس سے قبل جون وجولائی ۱۹۵۳ء کے "طلوع اسلام" میں اعلان کرچکا ہوں، اب یہ تیسرا اعلان ہے ۔ دریافتِ مقصد کیلئے کچھ خط آئے ہیں ۔ اجمالاً عرض ہے کہ میں ۱۹۴۳ء سے اس کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ قرآن کی علمی دعوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ، قرآنی نظام ومعاشرہ بھی عملاً قائم کرنے کیلئے سب کچھ قربان کردیا جائے ۔ پندرہ مطبوعات مفت تقسیم کرنے کیلئے ابتک شائع کرچکا ہوں ۔ بس اسی مقصد کیلئے ایسے حضرات کی تلاش ہے جو اپنی اس زندگی میں ہاتھ کے ہاتھ نقد اجر حاصل کرنے کی خواہش ختم کرچکے ہوں اور تمام تمناؤں کا گلا گھونٹ کر بیچ مچ اللہ تعالیٰ کا اعتبار کرکے، اپنے سب اعمال کے اجر کا قرض اب سے اسی پر چڑھانا شروع کردیں اور یہاں کی بجائے وہاں اپنا یہ قرض اللہ تعالیٰ سے وصول کریں ۔

رہا رفقاءِ کار کے رزق کا معاملہ تو یہ سب کا پیدائشی حق ہے (قرآنی نظام کی غیر موجودگی کی صورت میں) خواہ اس کا انتظام اللہ تعالیٰ مجھ ایسی حقیر ہستی کے ذریعے کرادے یا کوئی اور راہ پیدا فرمادے ۔ اس میں کسی کی چھوٹائی بڑائی نہیں ہے ۔ ہم سب مساوی انسان ہیں ۔

محمد احمد بٹلہ ۔ دارالشوریٰ ۔ صدر ۔ کراچی

وراثتِ ارض کا ابدی قانون

(پرویز)

[محترم پرویز صاحب کا یہ مضمون اپریل ۱۹۴۷ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا جبکہ اس کے قارئین کا حلقہ بڑا محدود تھا۔ اس لئے موجودہ قارئین میں سے اکثریت ان کی ہوگی جنھوں نے اس سے پہلے اس مضمون کو نہیں دیکھا۔

محترم پرویز صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے خیالات کو خارجی ہنگامہ آرائیوں سے متاثر نہیں ہونے دیا۔ وہ ہمیشہ اس راستے پر چلتے ہیں جس راستے کی طرف قرآن ان کی راہنمائی کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔

حصولِ پاکستان کے بعد جب پوری قوم اس خیال سے مطمئن تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں "حکومت" عطا کی ہے تو اس وقت اس قرآنی مفکر نے انھیں یہ بتایا کہ قرآن کی رُو سے ارض کی وراثت (حکومت و مملکت) صرف صلاحیت کے نتیجہ میں ملتی ہے اور چونکہ جو کچھ ہمیں ملا ہے وہ ہماری صلاحیتوں کا نتیجہ نہیں اسلئے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمیں "حکومت" (یا ارض کی وراثت) مل گئی ہے۔ یہ صرف تاریخ کا انگریز کی غلامی کی رنگداری ہے جس ایک موقعہ (opportunity) ملا ہے تاکہ ہم اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کر سکیں جو کسی قوم کو حکومت اور مملکت کا مستحق بنایا کرتی ہے۔ یہ تھا وہ بالکل نیا خیال جو انھوں نے زیر نظر مضمون میں ظاہر فرمایا تھا۔ اس مضمون کو لکھے ہوئے چھ برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ آپ اسے بغور پڑھئے اور پھر دیکھئے کہ جو بات پانچ سال پہلے کہی گئی تھی وہ اس تمام دوران میں کس طرح حرفاً حرفاً صحیح ثابت ہوتی گئی ہے۔ اس کے بعد سوچنے کی یہ چیز ہے کہ چھ سال کے اس طویل عرصہ میں ہم نے اپنے اندر وہ صلاحیت کس حد تک پیدا کی ہے جو حکومت و مملکت کا مستحق بننے کیلئے ناگزیر شرط ہے۔

ہم اس مضمون کو تشکیل پاکستان کی سالگرہ کی تقریب پر اسلئے شائع کر رہے ہیں کہ ایسے موقع پر طبائع بالعموم اپنے ماضی کو سامنے لاکر مستقبل کے متعلق سوچنے کیلئے زیادہ آمادہ ہوتی ہیں۔ طلوع اسلام]

نظامِ کائنات ایک معینہ قانون کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ذرۂ خاک سے لیکر بڑے سے بڑے کرۂ سماوی تک ہر شے زندانیٔ تقدیر ہے۔ آفتاب جہانتاب ایک مقررہ قاعدہ کے مطابق ہر صبح دریچۂ مشرق سے جھانکتا ہے اور ایک متعینہ شاہراہ پر چل کر ہر شام حجلۂ مغرب میں روپوش ہو جاتا ہے۔ اس کے دوران سفر میں ہر شے جس میں زندگی کی صلاحیت ہوتی ہے اس کے نور و حرارت سے اپنے سینے کو بھرپور کر لیتی ہے وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۳۶/۳۸)۔ چاند ایک خاص قاعدہ کے مطابق، ایک غوطہ خور کشتیٔ سیمیں کی طرح دریائے نیل سے ابھرتا ہے اور ایک خاص نظام کے تابع پھیلتا اور سمٹتا ہوا اپنے سفر کی منازل طے کئے جاتا ہے۔ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ (۳۶/۳۹) جب خزاں کی دست درازیاں

صحنِ گلستاں سے شگفتگی و شادابی کے تمام آثار و مظاہر کو، مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے متاعِ حیات کی طرح ختم کر دیتی ہیں تو فطرت کے ایک معینہ قاعدے کے مطابق نسیم بہار، مسرت اور شادمانیوں کی ایک رنگین و عطر آگیں دنیا اپنے جلو میں لئے آتی ہے اور زمین کے حسرت زدہ غم آلود چہرے کو پھر سے تبسم فشاں و قہقہہ بار بنا دیتی ہے۔ وَكَذٰلِكَ اللّٰهُ يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۵/۹) وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُوْنِ (۳۶/۳۴)۔

جس طرح یہ قوانین و ضوابط خارجی دنیا میں جاری و ساری ہیں، اسی طرح انسان کی داخلی دنیا میں بھی ان کی حکمرانی ہے اور جس طرح انسان کی انفرادی زندگی کی جوئے رواں انہی سواحل میں محصور ہے اسی طرح اس کی حیاتِ اجتماعیہ کا یم بیکراں بھی انہی حدود و ثغور میں مقید ہے۔ انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ میں سب سے اہم شعبہ نظامِ حکومت و آئینِ مملکت ہے جسے قرآن "وراثتِ ارض" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ حکومت کسے ملتی ہے اور کس طرح ملتی ہے؟ اور کس سے چھنتی ہے اور کیوں چھنتی ہے؟ اس کیلئے بھی خدا کا ایک ابدی قانون مقرر ہے جو سورۂ انبیاء کے ان بصیرت افروز الفاظ میں مرقوم ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ (۱۰۵-۱۰۶/۲۱)

اور ہم نے تورات کے بعد زبور میں (بھی) اس حقیقت کو لکھ دیا تھا کہ زمین کی وراثت ہمارے "صالح بندوں" کیلئے مقدر ہے (اس عظیم الشان قانون خداوندی میں) عبودیت اختیار کرنے والی قوم کیلئے ایک (عظیم القدر بصیرت افروز و حقیقت کشا) پیغام ہے۔

امانتِ حکومت و مملکت کی تفویض اور متاعِ جہانداری و جہانبانی کی وراثت کے متعلق یہ وہ ابدی قانون اور سرمدی اصول ہے جس کا نوشتہ خداوندی کی حیثیت سے اعلان کیا گیا ہے اور اس میں قوموں کے عروج و زوال اور امتوں کے استخلاف و استبدال کے متعلق ایک ایسے بنیادی معیار کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ہر صاحبِ بصیرت کے لئے پیغامِ عظیم اور بلاغِ مبین مضمر ہے۔ یہ بنیادی اصول کیا ہے؟ یہی کہ وراثتِ ارض کیلئے صلاحیت شرط ہے۔ یعنی وہی قانون جو عالم آفاق میں بقاء للاصلح کے محکم اصول کی حیثیت سے جاری و ساری ہے۔

صلاح کے معنی

"صلاح" دیکھنے کو تو چار حروف کا ایک مختصر سا لفظ ہے، لیکن اپنی جامعیت کے اعتبار سے ایسا ہمہ گیر ہے کہ اس میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر آ گئے ہیں۔ صالح کے معنی ہیں صحیح و سالم، تندرست و توانا، مستوی الجسم اور متناسب الاعضاء، زندگی کی تمام صلاحیتوں کو لئے ہوئے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے کہ جنین کی پیدائش سے پہلے میاں بیوی دونوں خدا سے دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (۱۸۹/۷) خدایا! ہمیں صحیح و سالم، تندرست توانا بچہ عطا کر دے تاکہ ہم تیرے شکر گزار بنیں ـــــ فَلَمَّا اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَا (۱۹۰/۷) لیکن جب اللہ انھیں تندرست توانا بچہ عنایت کر دیتا ہے تو اس بارے میں اللہ کے ساتھ اوروں کو بھی شریک بنانے لگ جاتے ہیں) اس جگہ صحیح و سالم اور تندرست و توانا بچہ کے لئے صَالِحًا کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اس کے مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے کہ حضرت زکریاؑ کے ہاں اولاد نہ تھی انھوں نے اس کیلئے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے ان کی رفیقۂ حیات کو جو عقیم تھیں اولاد کے قابل بنا دیا۔ وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (۹۰/۲۱) لہٰذا صلاح کے معنی ان قابلیتوں اور استعدادوں کا پیدا ہونا ہے جن سے تعمیری نتائج مرتب ہوں۔ ان ہی معنوں میں یہ لفظ سورۂ النور میں

استعمال ہوا ہے جہاں فرمایا کہ تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے (جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں میں موجود تھے) جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں (وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ ۲۴/۳۲) ان کے نکاح کردو۔

ان آیات سے صلاح وصالح کے معانی ہمارے سامنے آگئے جن سے واضح ہوگیا کہ اس قانونِ سرمدی کی رو سے جو ہمارے موضوع کا محور اور اس زندگی بخش داستان کا زیبِ عنوان ہے، زمین کی وراثت (حکومت ومملکت) کے مستحق وہی ہیں جو اس کی صلاحیت وقابلیت رکھتے ہوں، جن میں زندگی اور اس کی توانائیاں تڑپ رہی ہوں جن کے سینوں میں دم، جگر میں خون، بازوؤں میں قوت، پاؤں میں استقامت، ذہنوں میں جلا، نگاہوں میں روشنی، ارادوں میں بلندی اور عزائم میں پختگی ہو۔ جو دنیا میں عزت وشوکت کی زندگی بسر کرنے کی تمنا رکھتے ہوں اور اس تمنا کی تکمیل اور اس آرزو کے حصول کے لئے ایسی قوت فراہم کریں کہ جو قوم مخالف ان کے عزائم کی راہ میں مزاحم ہو اسے خس وخاشاک کی طرح بہا کرلے جائیں۔ دنیا میں جس کے پاس قوت نہیں اس کا کوئی دعویٰ سچا نہیں۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

جو اپنی قوتِ بازو سے زندہ رہنے کا حق قائم نہیں کرتا اسے کوئی زندہ رہنے نہیں دیتا۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ قانون جس کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو، وعظ اور ایڈیشن بن کررہ جاتا ہے۔ اسی لئے اس قانون کے ساتھ جسے دنیا میں دین کی حیثیت سے مستمر وممکن رہنا مقصود ہو، فولاد کی شمشیرِ جگردار کی بھی ضرورت ہے۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (۵۷/۲۵) ہم نے ضوابطِ دین اور میزانِ عدل کے ساتھ فولاد بھی نازل کیا جس میں بڑی شدت کی سختی ہوتی ہے۔ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵) تاکہ لوگ جادۂ عدل وانصاف پر قائم رہیں۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند

یہی قوت ہے جس کے متعلق فرمایا کہ

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸/۶۰)

جس قدر قوت کے ساز وسامان اور گھوڑوں کے پرے باندھ رکھنے کی تم میں استطاعت ہو وہ تم اللہ اور اپنے دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رکھو۔

قوت اور رباط الخیل کی جامعیت میں تمام سامان وآلاتِ حرب وضرب، ساز ویراقِ جنگ وجدل اور وسائل واسبابِ مدافعت ومحاربت شامل ہیں۔ زمانہ کے مقتضیات اور احوال وظروف کے تبدل وتغیر سے ان اسباب وذرائع کی نوعیتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن قوت کی وہ روح، جو زندگی کی اصل ہے، ہر جگہ بدستور قائم رہتی ہے۔ گوپیئے کے پتھر سے لیکر ایٹم بم کے گولے تک، تمام اسبابِ قوت ایک ہی روح کے مظاہر، ایک ہی اصل کی شاخیں، ایک ہی جان کے پیکر اور ایک ہی تلوار کی نیام ہیں۔ زمانے

کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان پیکروں کا بدلنا بھی ضروری ہے۔ اسلئے کہ جس قوت کی نوعیتیں وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں وہ قوت مصافِ زندگی میں اس طرح پیچھے رہ جاتی ہے جس طرح فلک پیما طیارہ کے مقابلہ میں راجہ جی کی بہلی"۔

بہرحال دنیا میں زندہ وہی رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی استعداد ہو آگے وہی بڑھتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی قوت ہو۔ لہذا حکومت ومملکت اسی کی تقدیر میں ہوتی ہے جس میں جہانبانی وجہانداری کی صلاحیتیں ہوں۔ اِنَّ فِی ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ۔

یہاں تک صالحیت کا صرف ایک گوشہ ہمارے سامنے آیا ہے جس کا نام خالص مادی قوت (Physical power) ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے **فقط** مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہو جاتی۔ اس میں تو کافر و مومن کی کوئی تمیز نہیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان کی کچھ تفریق نہیں۔ جو بھی مادی قوت حاصل کرلے وہ غلبہ و استیلاء حاصل کرسکتا ہے اور اس طرح صاحب حکومت و سلطنت بن سکتا ہے۔ آج دنیا میں جدھر نگاہ ڈالئے، انہی مادی قوتوں کا باہمی مقابلہ نظر آئے گا۔ جس کے پاس قوت اور اس سے حاصل کردہ سامان و ذرائع زیادہ ہیں وہی سب سے بڑی سلطنت وحکومت کا مالک ہے اور یہ صرف **آج** ہی پر کیا موقوف ہے دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے، ہر صفحہ پر یہی حقیقت فولاد کے ابھرے ہوئے آتشیں الفاظ میں آپ کے سامنے آئے گی۔

فساد اور اصلاح

لیکن جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، قرآن کی رو سے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہو جاتی اور صرف اس کے زور پر قائم کردہ غلبہ و استیلاء اور تسلط و تمکن سے اصلاح نہیں پیدا ہوتی۔ اس نے بتایا ہے کہ اصلاح وفساد، دو الگ الگ نتائج ہیں جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ جو نظام سلطنت فقط مادی قوتوں کے استیلاء پر قائم ہوتا ہے اس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔ سورۂ شعراء میں دیکھئے اس حقیقت کو کسقدر واضح طور پر بے نقاب کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ

وَلَا تُطِيعُوٓا۟ أَمْرَ ٱلْمُسْرِفِينَ ۔ ٱلَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۶/۱۵۲)

حدود فراموش سرکش قوتوں کے نظام کی اطاعت مت کرو۔ اسلئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، اصلاح نہیں کرتے۔

سورۂ نمل میں اسی ضمن (قصہ حضرت صالحؑ) میں ارشاد ہے کہ

وَكَانَ فِى ٱلْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۲۷/۴۸)

اور اس شہر میں نو اکابر (ارکانِ مملکت) تھے جو ملک میں فساد برپا کر رہے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کی ابتدائی آیات میں کہا گیا ہے کہ:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ قَالُوٓا۟ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۔ (۲/۱۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت برپا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے قرآن نے ان چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ عہد قدیم کے نماردہ و فراعنہ سے لیکر عصر حاضر کے "ہٹلران و چرچلان" میں سے کسی سے پوچھئے۔ ہر پیکر فساد و استبداد یہی کہے گا کہ ہماری غرض اصلاح ہے، مفسدین تو دوسرے ہیں۔

گذشتہ جنگ عمومی میں ہر فریق متخاصم کی زبان پر یہی تھا کہ ہم حق و صداقت اور عدل و انصاف کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور اب بھی مغربی بساطِ سیاست کے ہر مہرہ باز کا یہی اعلان ہے کہ انما نحن مصلحون۔ لیکن قرآن کی رو سے ہر وہ نظام جو انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتا ہے باطل کا نظام ہے جس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں۔ (فساد کے معنی ہی ناہمواری ہے)۔ اصلاح (یعنی معاشرہ میں ہمواریاں) صرف اس نظام کا نتیجہ ہے جس میں قوت کا استعمال آئینِ خداوندی کی تنفیذ و ترویج کیلئے ہوتا ہو۔ اس نظام کا فطری نتیجہ "ربوبیتِ عامہ" ہوتا ہے جس سے مفہوم ہے ایسی فضا جس میں ہر شخص کی فطری صلاحیتوں کے ابھرنے، نشوونما پانے اور تکمیل تک پہنچنے کیلئے یکساں مواقع میسر ہوں۔ شرفِ انسانیت اسی نظام میں ارتقائی منازل طے کر کے اپنی انتہا تک پہنچ سکتا ہے۔

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ محکومیت و اطاعت صرف احکامِ خداوندی کی ہوگی اور اس اطاعت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص کی کامل نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس ایمان کی بنیاد پر جو عمارت قائم ہوگی اس کا نام عملِ صالح ہے اور ان دونوں (یعنی زندگی کے اس نصب العین اور اس کے مطابق پروگرام) کا نتیجہ استخلاف فی الارض۔ یہی وہ استخلاف (وراثتِ ارض) ہے جس کے لئے صالحیت کی شرط ہے۔ یا یوں کہئے کہ جب اور جہاں اس قسم کی صالحیت پیدا ہوگی۔ وراثتِ ارض اس کا فطری نتیجہ ہوگا۔ اسی کا نام "اللہ کا وعدہ" ہے جس کا ذکر سورۂ نور کی ان درخشندہ آیات میں کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم (۲۴/۵۵)

اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ تم میں سے جو بھی ایمان لائیں گے اور صالح العمل ہوں گے انھیں اللہ زمین میں حکومت عطا کرے گا۔

جس طرح ان شرائط کے پورا کرنے والوں کو اس سے قبل، وراثتِ ارض کی نعمتوں سے مالا مال کیا گیا۔

یہ استخلاف (وراثتِ ارض) کس غرض کیلئے ہوگی؟ لیمکنن لہم دینہم الذی ارتضی لہم (۲۴/۵۵) تاکہ وہ نظام نہایت مضبوطی سے قائم کر دیا جائے جو اللہ نے ان کیلئے پسند کیا ہے اور ولیبدلنہم من بعد خوفہم امنا (۲۴/۵۵) تاکہ ان کی حالتِ خوف کو کامل امن و سکون سے بدل دیا جائے اور یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا (۲۴/۵۵) یہ صرف قوانینِ الٰہیہ کے مطیع و محکوم ہوں۔ دنیا کی کوئی قوت ان سے اپنی حاکمیت نہ منوا سکے۔ [1]

---

[1] اس مقام پر ایک اور اہم حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ قرآن کی رو سے "صالحین" انھیں کہتے ہیں جو حکومت و مملکت کے آئین و ضوابط سے واقف ہوں۔ جو جہانداری و جہانبانی کے انداز و اسلوب جانتے ہوں۔ جن میں سلطنت سنبھالنے اور نظم و نسق کو چلانے کی اہلیت ہو۔ جو جانتے ہوں کہ قوت کس طرح فراہم کی جاتی ہے اور اسے کس طرح کام میں لایا جاتا ہے۔ جنھیں معلوم ہو کہ سیاست کسے کہتے ہیں اور مدنیت کے تقاضے کیا کیا ہیں۔ اور اسکے ساتھ ہی وہ جانتے ہوں کہ وہ قوانینِ خداوندی کیا ہیں جن کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے اور جن کے مطابق انسانی معاشرے کو متشکل کرنا ہوگا۔ ان تمام خصوصیات کی حامل جماعت کا نام قرآن کی اصطلاح میں صالحین کی جماعت ہے۔

لیکن ہمارے دور میں ایک جماعت پیدا ہوگئی ہے جنھوں نے خود ہی اپنے آپ کو صالحین کہنا شروع کر دیا ہے ان کے نزدیک صالحین کے معنی ہیں ایسے لوگ جو داڑھیاں بڑھالیں اور اپنے پاجامے ٹخنوں سے اونچے کرلیں (ہوسکے تو سر پر چھپے بھی رکھ لیں) فقہ اور روایات کی چند کتابیں رٹ لیں اور انھیں ایسی زبان میں پیش کر سکیں جس میں انگریزی کے الفاظ شامل ہوں۔ ان "صلاحیتوں" کے بعد انھوں نے دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے کہ حکومت کی کنجیاں ان کے حوالے کر دی جائیں کیونکہ خدا کا ارشاد ہے کہ حکومت صالحین کو ملنی چاہیے اور یہ صالحین کہلاتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر کوئی مملکت اس قسم کے صالحین کے ہتّے چڑھ جائے تو اس کا حشر کیا ہوگا؟ (طلوعِ اسلام)

یہ ہے وہ استخلاف (حکومت) جو وراثتِ ارض کے قانونِ سرمدی کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔

ایک بنیادی فرق

لیکن اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ سوال اس قدر اہم ہے کہ اگر اس کا صحیح جواب سامنے نہ آئے تو اصلاح اور فساد کا فرق نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے اور انسان تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر صالحیت کی اس شرط کو پورا کرنے سے جو حکومت و مملکت عطا ہوتی ہے وہ اگر خدا کی طرف سے ملتی ہے (یرثہا عبادی الصّٰلحون) تو جو حکومت و سلطنت فقط مادی قوتوں کے زور سے حاصل کی جاتی ہے وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی؟ اگر وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی تو اسے کون دیتا ہے؟ اگر آپ بغور دیکھیں گے تو اس سوال کے ڈانڈے مسئلہ تقدیر سے جا ملیں گے۔ مسئلہ تقدیر کی بحث بڑی تفصیل طلب ہے اور اس وقت ہمارے موضوع سے خارج۔ اس مقام پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ جس انداز سے یہ مسئلہ عام طور پر مسلمانوں کے قلوب و اذہان پر مستولی ہے اور جس کی وجہ سے یہ قوم گذشتہ ایک ہزار برس سے راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے، اس سوال کا محرک بھی وہی خیال ہے۔ تقدیر کا یہ مفہوم ہمارے دورِ ملوکیت کی تخلیق ہے جسے من جملہ دیگر اغراض و مقاصد) ملوکیت کے استبداد کے "شرعی جواز" کی غرض سے وضع کیا گیا اور پھر سیاسی حیلہ کاریوں سے اس طرح پھیلایا گیا کہ یہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر امت کے قلوب کی گہرائیوں میں سرایت کر گیا اور وہاں سے آج تک نہیں نکل سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ہر قسم کی دولت اور قوت، حکومت و سطوت "خدا کی نعمت" اور اس کی "عطا فرمودہ" قرار پا چکی ہے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ دولت و قوت کس طریق سے حاصل کی گئی ہے اور اسے کس مصرف میں لایا جا رہا ہے؟ ہم جس دولت مند کا ذکر کرتے ہیں بلا تامل کہہ دیتے ہیں کہ اس پر "اللہ کا بڑا فضل" ہے۔ ہر صاحب شوکت و سطوت کے متعلق یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ "اللہ کی دین ہے"۔ اس غیر محسوس عقیدہ کی رو سے ہمارے نزدیک "دولت" خدا کی نعمت ہے خواہ وہ کسی نے ڈاکہ ڈال کر حاصل کی ہو یا اپنی محنت سے کمائی ہو۔ ہمارے ان قدیمی تصورات کی رو سے "حکومت" اللہ کا انعام ہے خواہ اسے ابلیسی تغلب اور طاغوتی سیاست کے بل بوتے پر قائم رکھا ہو یا ایمان و عمل صالحہ کی بنا پر۔ غور کیجئے! ہماری زبان میں "اللہ کی دین" کے مقابلہ میں کسی اور کی دین کیلئے کوئی اصطلاح ہی موجود نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک ڈاکو کو بھی خدا دیتا ہے اور ایک مردِ کاسب کو بھی۔ لہذا طاغوتی قوتوں کی حکومت بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور اس لئے اس کے قانونِ وراثت (یرثہا عبادی الصالحون) کے تابع اور اس بنا پر صالحین کے معنی ہو جاتے ہیں، ہر وہ گروہ جو حکومت قائم کرنے کی قوت پیدا کر لے لیکن ظاہر ہے کہ اگر فرعون کی حکومت بھی قانونِ خداوندی ہی کی رو سے ملی تھی تو حضرت موسیٰؑ کو اس کے خلاف اتنی بڑی مہم کے لئے کیوں مامور کیا گیا تھا؟ اگر باطل کا دولتی نظام بھی اسی ابدی قانونِ وراثت کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس کی جگہ حق کا نظام قائم کرنے کیلئے اس قدر سرفروشیوں اور جاں سپاریوں کی تاکید کیوں کی جاتی ہے؟ حق و باطل کی یہ کشمکش و پیکار تو اسی بنا پر ہے کہ باطل منجانب اللہ نہیں ہوتا۔ اگر قانونِ وراثتِ ارض، صرف حصولِ قوت ہی کا دوسرا نام ہے تو اس کے لئے عرشِ عظیم سے آنے والے پیغامات کی کیا ضرورت ہے۔ اسے تو دنیا کا ہر ہلاکو اور ہر چنگیز خاں از خود جانتا ہے۔ اگر نیٹشے کا مافوق البشر، قرآن کا مردِ مومن ہے تو پھر حکمتِ فرعونی اور حکمتِ کلیمی میں کیا فرق ہے؟ لہذا یہ ظاہر ہے کہ خالص قوت کی بنا پر جو نظامِ حکومت قائم کر لیا جاتا ہے اسے خدا کے متعین فرمودہ قانونِ وراثت کا نتیجہ اور فلہذا من جانب اللہ نہیں کہا جا سکتا۔

من جانب اللہ استخلاف فی الارض وہی ہوتا ہے جو اس کے قانونِ سرمدی کا نتیجہ اور قرآنی صالحیت کا ثمرہ ہو۔ اور یہی وہ استخلاف ہے جو ہمارے موضوع کا عنوان ہے۔ اور اسی سے مسلمان کو سروکار ہونا چاہیئے۔

قوم کی مختلف حالتیں صالحیت کا قرآنی مفہوم متعین کرنے کے بعد اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔ وراثتِ ارض (یعنی قوانینِ الٰہیہ کے مطابق حکومت قائم کرنے) سے پہلے، عام طور پر، قوم کی حالت یہ ہوگی کہ (۱) یا تو ان پر کسی دوسرے کی حکومت نہیں ہوگی یعنی ان کی اپنی حکومت ہوگی لیکن اسی آئین کے مطابق جس کی رو سے عام انسانی حکومتیں قائم ہوتی ہیں، یا (۲) سرے سے کسی دولتی نظام کا وجود ہی نہ ہوگا اور قوم قبائلی قسم کی زندگی بسر کر رہی ہوگی۔ یا (۳) وہ قوم کسی غیر حکومت کی محکوم ہوگی۔ اول الذکر صورت میں (یعنی جب حکومت اپنی ہو یا سرے سے کسی منظم حکومت کا وجود ہی نہ ہو) اس قوم کو اس کی **امکانی قدرت** حاصل ہوگی کہ وہ چاہے تو اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے آئینِ خداوندی کے مطابق وراثتِ ارض کی دولت سے متمتع ہو جائے۔ اس صورت میں مقابلہ ان لوگوں سے ہوگا جو اس انداز کی حکومت کے قیام میں اپنی ذاتی اغراض کا نقصان و زیان سمجھتے ہوں اور اسلئے اس تحریک کی مخالفت میں سرگرمِ عمل ہو جائیں۔ ایسی صورت میں وہ قوم یا تو فریقِ مخالف پر غلبہ حاصل کر لے گی اور اگر اس کا فوری امکان نہ ہوگا تو کسی اور خطۂ ارض کی طرف ہجرت کر کے اسے اس آئینِ حکومت کی قرارگاہ بنا لے گی۔ یہ وراثتِ ارض فطری نتیجہ ہوگی ان کی صالحیت کا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے وقت، قوم مخاطب کی یہی حالت تھی۔ عرب کسی غیر حکومت کے تابع نہیں تھے۔ قبائلی زندگی بسر کرتے اور اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے تھے۔ اسلئے انہیں امکانی قدرت حاصل تھی کہ وہ چاہتے تو اپنے اندر داخلی تبدیلیاں پیدا کر کے وراثتِ ارضی کے مستحق بن جاتے۔ نبی اکرمؐ کی بصیرت افروز تعلیم اور حقیقت کشا عمل سے اس قوم نے وہ تربیت حاصل کر لی، جس سے ان کے خفتہ جوہر بیدار ہو گئے اور وہ قوم صلح بن کر استخلاف فی الارض کے مقامِ محمود تک پہنچ گئی۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ وذٰلک الفوز العظیم۔

بنی اسرائیل کی مثال دوسری صورت کی مثال ہمارے سامنے قوم بنی اسرائیل کی ہے جو دعوتِ حضرت موسیٰؑ کے وقت فرعونِ مصر کے پنجۂ قہرمانیت میں گرفتار تھی جسے قرآن نے سوء العذاب اور بلاءٌ عظیم کی جامع مصطلحات سے تعبیر کیا ہے۔ ان پر فرعونی حکومت کے مستبد قوانین مسلط تھے اس لئے وہاں رہتے ہوئے انہیں اس کی **امکانی قدرت** حاصل نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے جوہرِ خوابیدہ کو بیدار کر کے ان میں نمود و بالیدگی پیدا کر سکیں۔ اس کے لئے آزاد فضا کی موجودگی نہایت ضروری تھی۔ یعنی بالفاظِ دیگر صورت یہ پیدا ہو چکی تھی کہ

(۱) جب تک وہ اپنے اندر صالحیت نہ پیدا کر لیں، آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔

(۲) لیکن صالحیت پیدا نہیں ہو سکتی تھی جب تک وہ فرعون کے پنجۂ استبداد سے آزاد نہ ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں بنی اسرائیل کیلئے فرعون کی محکومیت سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن

بعض اوقات ایسے غیر متوقع حالات پیدا ہوجاتے ہیں جن سے اگر بروقت فائدہ اٹھا لیا جائے تو قوم کی گردن سے غیروں کی غلامی کا جوا اتر جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس طرح سے آزادی کا حاصل ہوجانا اس قوم کی صلاحیتوں کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ ہنگامی صورتِ حالات سے فائدہ اٹھا لینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کو فرعون کی محکومیت سے نجات اسی انداز سے ملی تھی۔ یعنی ایسا نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے اپنے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کر لی تھیں جن سے غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئی تھیں۔ ہوا صرف یہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ آئے اور اپنی غیر معمولی قوتوں کے زور پر قوم کو ملک سے نکال کر باہر لے گئے۔ اسی لئے قرآن نے اسے "عدل" سے تعبیر نہیں کیا بلکہ "احسان" سے تعبیر کیا ہے یہاں فرمایا کہ

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین۔ ونمکن لھم فی الارض (۲۸/۵-۶)

اور ہم نے چاہا کہ وہ لوگ جنھیں ملک میں (غلامی و محکومی کے شکنجوں میں جکڑ کر) بے حد کمزور کر دیا گیا تھا ان پر احسان کریں اور انھیں امام (قوموں کی قیادت کرنے والے) بنائیں۔ اور انھیں (حکومت و مملکت کا) وارث بنائیں اور (اس طرح) انھیں زمین میں متمکن کر دیں۔

لہٰذا انھیں فرعون کی غلامی سے نجات، بطورِ انعام دلا دی گئی اور انھیں ایمن کی وادیوں میں پہنچا دیا گیا جہاں ان پر کسی غیر کی حکومت نہ تھی اور اس طرح ان کیلئے ایسی **امکانی قدرت** پیدا کر دی گئی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو تربیت دیکر وراثتِ ارض کے مستحق بن جائیں۔

پاکستان کے مسلمان ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان بالکل اسی طرح ملا ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وراثتِ ارض یا استخلاف ہے، وہ حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وراثتِ ارض بلا مزد و معاوضہ نہیں ملا کرتی۔ وہ فطری نتیجہ ہوتی ہے قوم کی صلاحیتوں کا۔ انعاماً اور احساناً صرف غیروں کی غلامی سے رستگاری عطا ہوتی ہے تاکہ اس سے صلاحیت پیدا کرنے کی امکانی قدرت نصیب ہوجائے۔ ہمیں اس وقت صرف ایک خطۂ زمین ملا ہے جس پر کسی کی حکومت نہیں۔ اب ہم چاہیں تو

(۱) اپنے اندر صلاحیت پیدا کر کے، اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھا دیں۔

(۲) صرف مادی قوتوں کے زور سے غلبہ و استیلاء پیدا کر کے اسی قسم کی سلطنت تشکیل کر لیں جس قسم کی سلطنتیں دوسری قوموں نے قائم کر رکھی ہیں۔ اور یا

(۳) موجودہ جمود و تعطل اور بے عملی اور بے حسی کی زندگی سے اس امکانی قدرت کو بھی کھو بیٹھیں اور پھر کسی اور کی غلامی سے بدستور سابق جہنم کی لعنتی زندگی میں گرفتار ہوجائیں۔

ہم نے کہا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہی ہے جیسی اس وقت بنی اسرائیل کی تھی۔ آئیے دیکھیں کہ اس حالت میں بنی اسرائیل نے کیا کیا۔ اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ وفیھا بصائر لقوم یعقلون۔

بنی اسرائیل کو اللہ کی اس موہبتِ عظمیٰ پر قدم قدم پر تشکر و امتنان کے سجدے کرنے چاہئیں تھے۔ یہ انعام کچھ چھوٹا انعام، اور یہ احسان کچھ کم احسان نہ تھا۔ فرعون جیسے مجسمہ استبداد و قہرمانیت کے دستِ جور و ستم سے رستگاری کوئی معمولی بات نہ تھی لیکن صدیوں

کی غلامی سے بنی اسرائیل کے جوہرِ انسانیت قریب قریب مردہ ہو چکے تھے۔ نہ ان کے سینہ میں زندہ آرزوؤں کی مقدس قندیل تھی نہ ان کی نگاہوں میں بلند مقاصد کی عالمتاب درخشندگی۔ دنیا میں غلامی ہزار لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ نحوستوں کی ایک

قوم بنی اسرائیل کی حالت

نحوست ہے۔ غلامی میں وہ تمام عیوب و نقائص جنہیں جذامِ انسانیت کے لئے جذام کہنا چاہیئے، اس انداز سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے تباہ کن اثرات کب اور کن راہوں سے خون کے اندر حلول کر گئے۔ غلامی میں انسان زندگی کے حقائق کے مقابلہ سے جی چراتا ہے اور قفس کے خوگر پرندے کی طرح اس عافیت کوشی کی زندگی کو عینِ حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں   گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

صدیوں کی غلامی سے ان میں عزم و استقلال کے جوہر بہت کم رہ گئے تھے۔ محکومی سے تن آسانی اور سہل انگاری کی افسردگی ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور وہ اس نہجِ زندگی کے اس درجہ عادی ہو چکے تھے کہ ان پر

قفس ہوا تھا حلال اور آشیانہ حرام

نتیجہ اس کا یہ کہ وہ ہر انقلاب آفریں تدبیر میں مصائب و مشکلات کے طوفان پوشیدہ دیکھتے تھے۔ تبدیلئ احوال کے تصور سے ان کا دل بیٹھنے لگتا تھا حضرت موسیٰؑ انہیں بار بار تاکید کرتے کہ ذرا ہمت اور استقلال سے کام لو اور پھر دیکھو کہ اللہ کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ راستہ کی مشکلات کو استقامت سے برداشت کر جاؤ، انجام کار میدان تمہارے ہی ہاتھ رہے گا۔ ذرا اپنے اندر صلاحیت پیدا کر لو، وراثتِ ارض تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

قال موسی لقومہ استعینوا باللہ واصبروا۔ ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ۔ والعاقبۃ للمتقین (۷/۱۲۸)

تب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا۔ قوانینِ خداوندی سے فتح و نصرت کی مدد مانگو اور (اس راہ میں) جمے رہو بلاشبہ زمین (کی بادشاہت) صرف خدا کے لئے ہے جسے وہ اپنے بندوں میں سے انہیں دیدیتا ہے جو اسے اس کے قانون کے مطابق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ بندے جنہیں آخر الامر حکومت حاصل ہوتی ہے وہ ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو اس کے قانون سے ہم آہنگ کر لیں۔

لیکن اس تذکیر و تنذیر سے ان پیکرانِ آب و گل کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑانا آسان نہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ انہیں عزم و استقلال کے لئے ابھارتے اور وہ اُلٹے شکوہ سنج ہوتے کہ "تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبتوں میں رہے اور اب تمہارے آنے کے بعد ان میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔" ہم سمجھے تھے کہ اب آرام سے گذرے گی لیکن تم نت نئے دن ایک نیا مرحلہ سامنے لے آتے ہو تم اچھے چارہ ساز بن کر آئے۔

قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد ما جئتنا۔ قال عسی ربکم ان یھلک عدوکم ویستخلفکم فینظر کیف تعملون ۰ (۷/۱۲۹)

انھوں نے کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہمیں اذیتیں پہنچ رہی تھیں اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ موسیٰؑ نے کہا کہ

قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کردے اور تمہیں استخلاف فی الارض عطا فرمائے۔ پھر دیکھے کہ تم کیسے کام کرتے ہو!

لیکن جن لوگوں کی ہڈیوں کے گودے کے اندر تک محکومیت کے جراثیم گھر کر چکے ہوں، جو خوئے غلامی میں پختہ ہو چکے ہوں ان پر بھلا ان حیات آور خطبات اور زندگی بخش پیغامات کا کیا اثر ہو؟ جب حضرت موسیٰ انھیں مصر سے نکال کر لے چلے ہیں تو وہ اس طرح پا بجولاں جا رہے تھے، جیسے کہیں بیگار میں پکڑے جا رہے ہوں۔ جب وہ سمندر کے کنارے پہنچے اور پیچھے سے فرعون کا لشکر تعاقب میں آیا تو انھوں نے چلانا شروع کر دیا کہ ہمیں موت کے منہ میں دھکیل کر لے آئے ہو؟

فلما ترٰاء الجمعٰن قال اصحٰب موسٰی انا لمدرکون (۲۶/۶۱)

جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم یقیناً (پھر) قابو آگئے۔

توراۃ میں ہے:

اور جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں اور مصریوں اپنے پیچھے آتے دیکھا تو وہ شدت سے ڈرے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی اور موسیٰ سے کہا کہ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کیلئے لایا؟ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا تا کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا۔ (خروج ۱۴/۱۰-۱۲)

غلامی کے اثرات

غور کیجئے! غلاموں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح چھلک کر باہر آرہی ہے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ مصریوں کی خدمت گذاری اس سے کہیں بہتر تھی۔ اس سے بڑی بدبختی اور کس کی ہوگی جو قفس کو آشیانہ سے بہتر سمجھے کہ آشیانہ میں کہیں خوفِ برق ہے کہیں خطرۂ صرصر۔ کبھی فکرِ معاش ہے اور کبھی خدشۂ صیاد۔ قفس کی زندگی میں یہ تمام تفکرات و خدشات آقا کے ذمے تھے۔ اللہ اکبر! "حکمراں کی ساحری" بھی کس درجہ کامیاب ہوتی ہے جو انسان کی فطرت بدل دیتی ہے۔ وہ فطرت صحیحہ جو انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ

حیات جاوداں اندر ستیز است

اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ خطرہ نہیں، بلکہ خطرہ کا تصور بھی اسے مرگِ ناگہانی بن کر دکھائی دیتا ہے۔ محکومیت کی افیون سے اس کے قوائے عملیہ اس درجہ مخدر ہو جاتے ہیں کہ جدوجہد اور سعی و کاوش کی زندگی اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہے۔ عافیت کوشی اور سہل انگاری سے کہ جس کے لئے حاکم قوم کی طرف سے خاص طور پر اسباب و ذرائع مہیا کئے جاتے ہیں۔ ان کی قوتِ برداشت بالکل سلب ہو جاتی ہے اور وہ بات بات پر چھلا اٹھتے ہیں۔ محکومیت کا زہر کس قدر میٹھا، خواب آور اور چپکے چپکے غیر محسوس طور پر موت کی طرف لے جانے والا ہوتا ہے! یہی زہر تھا جو بنی اسرائیل کے خون کے ہر ذرہ میں سرایت کر چکا تھا اور انھیں ذرا سی تکلیف پر اس کا دلی افسوس ہوتا تھا کہ ہم مصر کی محکومیت سے کیوں آزاد ہو گئے۔ چنانچہ توراۃ میں دوسری جگہ ہے:

پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت زمین مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرھویں دن سین کے بیابان

ہیں، جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس میدان میں موسیٰؑ اور ہارونؑ پر جھنجلائی اور بنی اسرائیل بولے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے، زمین مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھے تھے، اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے، مارے جاتے کیونکہ تم ہم کو اس بیابان سے نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کردو۔ (خروج ۱۶/۱-۳)

آپ نے دیکھا کہ انھیں کس چیز کی یاد ستا رہی تھی؟ "گوشت کی ہانڈیوں کی"! یعنی جیل خانے کی روٹیوں کی یاد! یا للعجب!! سحر حکمرانی کس قدر قلبِ ماہیت پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے دیدہ شاہیں میں نگہِ خفاش رکھدی جاتی ہے، جو جہنم کے شجرۃ الزقوم کو ثمرِ بہشت بنا کر دکھاتی ہے۔ یہی کیفیت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی۔ ایک میدان میں پہنچے جہاں ذرا پانی کی قلت تھی تو پھر وہی واویلا مچانا شروع کر دیا کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے ہو؟

تب بنی اسرائیل کی جماعت نے قیدیم میں ڈیرا ڈالا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا۔ سو لوگ موسیٰؑ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ ہم پئیں۔ موسیٰؑ نے انھیں کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خداوند کا کیوں امتحان کرتے ہو؟ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے۔ سو لوگ موسیٰؑ پر جھنجلائے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں کو اور ہماری مواشی کو پیاس سے ہلاک کردے۔ (خروج ۱۷/۱-۳)

غرضیکہ وہ قدم قدم پر روٹھ جاتے تھے اور ہر بار یہی طعنہ دیتے تھے کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے؟ قرآن کریم نے اس قوم کی داستانِ زندگی کو اس لئے اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے اور مختلف مقامات پر اُسے بار بار سامنے لاتا ہے کہ اس کے اندر دیدہ بینا کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اللہ کی وہ موہبت و نعمت، جو انھیں بلا محنت و مشقت مل گئی تھی، ان کے لئے وبالِ جان اور بلائے بے درمان بن رہی تھی۔

بخودکے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے
ہزاراں سال منزل در مقامِ آذری کردہ

انھیں مصر کی لعنتی زندگی سے نکال کر سینا کے میدانوں میں اسلئے لایا گیا کہ وہ اپنے جوہرِ خودی کی تربیت کریں اور اس طرح اپنے اندر ایسی فولادی سیرت پیدا کرلیں جس سے مصافِ زندگی میں ہر مشکل کا مقابلہ ہوسکے اور یوں اپنے پیکرِ خاکی کے ذراتِ کہن کو ترکیب نو دیکر اس سے ایک جہانِ دیگر کی تعمیر کرلیں کہ جو وراثتِ ارض کی قرارگاہ پائے لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ قدم قدم پر موسیٰؑ کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے اور عجیب و غریب مطالبات پیش کرتے۔ سینا کی وادیوں سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی بت کی پوجا کر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہوگئے کہ ہمیں بھی ایسا ہی بُت بنوا دیجئے! قالوا یموسی اجعل لنا الٰھا کما لھم الھۃ (۷/۱۳۸) حتیٰ کہ حضرت موسیٰؑ جب چند روز کیلئے طور کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے تو انھوں نے گوسالۂ سامری کی پرستش شروع کردی جب ان سے کہا گیا کہ تورات کے احکام کی پابندی کرو کہ یہ احکام تمہارے خدا نے دیئے ہیں تو اَڑ کر بیٹھ گئے کہ لن نؤمن حتی نری اللہ جھرۃ (۲/۵۵) "ہم کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم خدا کو کھلے طور پر نہ دیکھ لیں"۔ وادی ایمن میں صحرا کی صاف و سادہ غذا مائدۂ فطرت پر کھانے کو ملتی تھی لیکن انھیں رہ رہ کر شہر کی چٹپٹی زندگی کی یاد ستاتی تھی۔ چند روز کے بعد منہ بسور کر بیٹھ گئے کہ لن نصبر

علی طعام واحد (۲/۶۱) ہم سے ہر روز ایک ہی چیز نہیں کھائی جائے گی"۔

جب محکوم قوم کے قوائے عملیہ مضمحل اور ان کے جوہر مردانگی مسلوب ہو جاتے ہیں تو ان کے پاس فقط باتیں ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں عمل کے بجائے شاعری شروع کر دیتی ہے۔ بات بات پر منطقی موشگافیاں، قدم قدم پر فلسفیانہ نکتہ آرائیاں۔ زندہ قوموں کا شیوۂ زندگی ہوتا ہے "سمعنا واطعنا" سنا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ وہ کام زیادہ کرتے اور باتیں بہت کم۔ لیکن محکوم قوم باتیں ہی باتیں کرتی ہے، کام بالکل نہیں کرتی۔ یہی حالت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ ایک گائے ذبح کر لو۔ کسقدر صاف اور سیدھی بات تھی، لیکن سورۂ بقرہ کو اٹھا کر دیکھئے۔ انھوں نے اس پر بھی کتنی باتیں بنائی ہیں اور کس طرح بال کی کھال نکالنا شروع کی ہے۔ یہ ہوتی ہے محکوم کی ذہنیت!

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، مصر سے خروج، بنی اسرائیل کے لئے مقصود بالذات نہ تھا۔ فرعون کی محکومیت سے رستگاری اس مقصد کیلئے ہوئی تھی کہ یہ قوم صحرائے سینا کی تربیت گاہ میں اپنے اندر صالحیت کے جوہر پیدا کرے تاکہ ارض مقدس (فلسطین) کی وراثت ان کے حصہ میں آجائے۔ حضرت موسیٰؑ انھیں سرزمین فلسطین کے کنارے تک لے گئے اور ان سے کہا کہ یہ ہے وہ زمین جو تمہارے خدا نے تمہارے نام لکھدی ہے۔ اٹھو اور اس پر قبضہ کر لو۔

یٰقوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا خٰسرین (۵/۲۱)

لوگو! اس مقدس سرزمین میں جسے خدا نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے (یعنی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے عزم و ہمت کے ساتھ) داخل ہو جاؤ۔ اور الٹے پاؤں پیچھے کی طرف نہ مڑو (کہ کامیاب ہونے کے بجائے) نقصان اور تباہی میں پڑ جاؤ گے۔

لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ ضعفِ خودی سے ان پر خوف طاری تھا۔ سپاہیانہ عزم کے تصور سے ان پر رعشہ چھا رہا تھا۔ فریق مقابل کے آدمی انھیں دیو نظر آتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا:

قالوا یٰموسیٰ ان فیھا قوما جبارین۔ وانا لن ندخلھا حتی یخرجوا منھا۔ فان یخرجوا منھا فانا داخلون (۵/۲۲)

لوگوں نے اس کے جواب میں کہا اے موسیٰؑ اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بہت ہی زبردست ہیں (ہم میں ان کے مقابلہ کی تاب نہیں) جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ وہاں سے از خود نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔

ذرا غور کیجئے اس منطق پر کہ فریق مقابل از خود وہاں سے نکل جائے ہم پھر آگے بڑھیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے بہتیرا سمجھایا لیکن ان پر اس پند و موعظت کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

قالوا یٰموسیٰ انا لن ندخلھا ابدا ما داموا فیھا فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون۔ (۵/۲۴)

وہ بولے اے موسیٰؑ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں۔ (اور اگر تم وہاں جانے پر ایسے ہی

مصر ہو تو تم خود چلے جاؤ اور تمہارا رب[1] بھی تمہارے ساتھ چلا جائے۔ تم دونوں وہاں ان کے ساتھ لڑنا (جب فتح ہو جائے ہمیں آواز دے دینا) ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

یعنی! جواب مل گیا کہ ہماری بہبودی کی ایسی ہی تڑپ ہے تو جائیے ان لوگوں سے لڑیئے اور اپنے ساتھ (معاذ اللہ) اپنے اس خدا کو بھی لے جائیے جس نے فتح و کامرانی کا وعدہ دے رکھا ہے۔ ہم یہاں انتظار کرتے ہیں۔ جب دشمن مغلوب ہو جائے تو ہمیں آواز دے لینا ہم پہنچ جائیں گے۔ اللہ اکبر! کیا ذہنیت ہے غلامی کی!!

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیا وہ لوگ بلا محنت و مشقت وراثتِ ارض کے مستحق ہو گئے؟ کیا انھیں وہ سرزمین یونہی اتفاقاً مل گئی؟ بالکل نہیں۔

قال فانها محرمة عليهم اربعين سنة يتيهون في الارض فلا تاس على القوم الفسقين - (5/26)

اللہ کا حکم ہوا کہ (جب ان لوگوں کی حالت یہ ہے تو) اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی۔ یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے۔ سو اے موسیٰؑ تم ان نافرمان لوگوں کے اس مآل پر غمگین مت ہو (وہ اپنے اندر جوہر ہی نہیں پیدا کرنا چاہتے اسلئے وہ اس محرومی کے مستحق ہیں)۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ آب و گل کے ان پیکروں کو چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھراتے رہے تاکہ اس افیون خوردہ جماعت کا کوئی فرد باقی نہ رہے اور جب ان کی نئی نسل، جن کی تربیت مصر کی محکومی کی فضا سے الگ کر کے کی گئی تھی، بڑھ کر جوان ہو اور وہ اپنے اندر اس صلاحیت کو پیدا کرلے جو وراثتِ ارض کیلئے شرط ہے تو پھر ان کے ہاتھوں خدا کا نوشتہ پورا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب اس نئی پود نے اپنے اندر صلاحیت پیدا کر لی تو وہ ایک ہی جست میں تمام منازل طے کر گئے اور استخلاف فی الارض کی مسند پر متمکن ہو گئے۔ کذلک واورثنٰھا بنی اسرائیل (26/59)

واورثنا القوم الذين كانوا يستضعفون مشارق الارض ومغاربها التي بركنا فيها - وتمت كلمت ربك الحسنى على بني اسرائيل - بما صبروا - (7/137)

اور جس قوم کو حقیر و کمزور خیال کیا جاتا تھا اسی کو ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالامال ہے وارث کر دیا اور اس طرح تیرے اللہ کی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی اس لئے کہ وہ ہمت و استقامت سے جمے رہے تھے۔

یہ وراثت صلاحیت کا فطری نتیجہ تھی اور صلاحیت، جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، ایمانِ محکم اور عملِ پیہم سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو قرآن نے "ایقان و صبر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے۔

وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا - وكانوا بايتنا يوقنون - (32/24)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی قیادت کرتے تھے اور یہ اس لئے تھا کہ انھوں نے ثبات و استقامت کا ثبوت دیا اور وہ ہماری آیات پر محکم یقین رکھتے تھے۔

---

[1] رب کے معنی بڑے بھائی کے بھی ہیں۔

نخوتِ نشیمن نگر

یہ ہیں داستان بنی اسرائیل کے وہ اجزا جو ہمارے موضوع زیر نظر سے براہِ راست متعلق[1] ہیں۔ اس میں استخلاف فی الارض (وراثتِ زمین) کے سلسلہ کی دو متمیز و بین کڑیاں سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ جسے ابتدائی حصہ کہنا چاہئے، جس میں غیروں کی محکومیت سے اسلئے رستگاری ملتی ہے کہ اس قوم کو اپنی صلاحیتوں کے نمود و ارتقا کے لئے امکانی مواقع مل جائیں اور دوسرا حصہ وہ ہے جس میں صالحیت کی پختگی کے بعد وہ قوم وراثتِ ارض کی مستحق قرار پاجائے۔ حصول صالحیت کا ابتدائی مرحلہ ہو یا استخلاف و وراثت کا ثانوی حصہ، دونوں میں مواقع اس لئے بہم پہنچائے جاتے ہیں کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ قوم اس قدرت و اختیار سے کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔ پہلے مرحلہ میں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ قوم اپنے اندر حکومت کی صلاحیت پیدا کرتی ہے یا نہیں۔ اور دوسرے میں یہ کہ قوت و اختیار ملنے کے بعد وہ قوم اس کا استعمال صحیح طور پر کرتی ہے یا نہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے، جبکہ وہ ابھی فرعون کے زیر حکومت تھی، کہا۔ ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون (۷/۱۲۹) "قریب ہے کہ اللہ تمہیں استخلاف فی الارض عطا کردے پھر دیکھے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔" اور قوم محمد رسول اللہ سے کہا گیا کہ

ولقد اھلکنا القرون من قبلکم لما ظلموا وجاءتھم رسلھم بالبینت وما کانوا لیؤمنوا۔ کذٰلک نجزی القوم المجرمین۔ ثم جعلنٰکم خلٰئف فی الارض من بعد ھم لننظر کیف تعملون (۱۰/۱۳-۱۴)

اور یقیناً (ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل نے) تم سے پہلے کئی نسلوں کو ہلاک کر دیا جب ان کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ (جادۂ عدل وانصاف سے ہٹ کر) ظلم کرنے لگ گئے (حالانکہ) ان کے رسول ان کے پاس واضح حقائق لیکر بھی آئے لیکن بایں ہمہ ایسا نہ ہوا کہ وہ ایمان لے آتے۔ اس طرح ہم مجرم اقوام کو سزا دیا کرتے ہیں پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین کی حکومت عطا کی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح کا عمل کرتے ہو۔

لہذا، امکانی مواقع یا قوت و اختیار کے خزانے اسلئے ملتے ہیں لننظر کیف تعملون، تاکہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

ہماری حالت

ان اصول و مبادیات کو سمجھ لینے کے بعد اب اپنی موجودہ حالت کی طرف آئیے اور اسی آئینے میں اسے بھی دیکھئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی سرزمین ہمیں بغیر صلاحیت کے مل گئی ہے۔ یہ ہماری سعی و عمل اور تگ و تاز کا نتیجہ نہیں۔ ہمارے اندر قطعاً وہ داخلی تبدیلیاں پیدا نہیں ہوئیں جن کا مظہر خارجی تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ کیا عوام اور کیا خواص، ہم سب اسی طرح پر کھڑے ہیں جہاں اس سے پہلے تھے۔ صالحیت تو بہت بڑی چیز ہے، ہم میں تو وہ صلاحیت و استعداد بھی پیدا نہیں ہوئی جو محض مادی قوتوں کی بنا پر حصولِ مملکت و سلطنت کے لئے زندہ رہنے کی متمنی قوموں میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ ان قوموں کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے جنھوں نے اپنے اغراض و منافع اور ذاتی مقاصد و مطامع کی خاطر دوسروں کے نظامِ سلطنت سے رستگاری حاصل کرنے، یا اپنے تصورات کے مطابق بساطِ حکومت

---

[1] داستانِ بنی اسرائیل اپنے اندر عبرت و موعظت کے ہزار سامان رکھتی ہے اور ہمارے حالات پر تو یہ اس طرح منطبق ہوتی ہے جو پڑھے گا بیں نگاہ سے دیکھے گی بےساختہ پکار اٹھے گی کہ ع ارے دل یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے ـــ اس داستان کی تفاصیل (تضمنات) معارف القرآن جلد سوم میں ملیں گی۔

پہنچانے کیلئے جد وجہد کی، اور پھر دیکھئے کہ اس باب میں انھیں کیا کیا مصائب برداشت کرنے پڑے اور انھوں نے ان سب شدائد ونوائب کا کس پامردی واستقامت، حوصلہ وہمت، عزم واستقلال سے مقابلہ کیا اور اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر کس طرح مستانہ وجانفروشانہ انداز سے، ہر مخالف قوت کی صفیں چیرتے ہوئے، آگے بڑھتے چلے گئے۔ ابھی کل کی جنگِ عمومی کو دیکھئے محض ملکی حفاظت اور قومی اجارہ داریوں کی حصارت کے لئے مختلف اقوامِ مغرب نے کس کس ایثار وقربانی سے نامساعدت حالات کا مقابلہ کیا۔ ان سب حقائق کو سامنے رکھئے اور — باز بچو نشین نگر — یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ہم میں فی الواقعہ عام قومی خصائص بھی پیدا نہیں ہوئے چہ جائے کہ ہمارے اندر صفاتِ الٰہیہ منعکس ہوں اور ہم صبغۃ اللہ کے مشہود پیکر دکھائی دیں۔

بآدمے نرسیدی خدا چہ می جوئی

گزشتہ ابتلاء وانتشار (یعنی تقسیم ہند کے قیامت خیز حوادث) میں، ہم نے ایک طرف جس عدم تدبر اور افلاسِ نظر اور دوسری طرف جس فقدانِ ضبط واستقامت اور حرمانِ عزم وثبات کا مظاہرہ کیا ہے۔ نہیں! اس سے بھی آگے بڑھئے۔ ہم نے ایک طرف — جن کفن دزدیوں اور مردار خوریوں، جن "یوسف فروشیوں" اور "یعقوب فریبیوں" اور دوسری طرف جن افراتفریوں اور نفسا نفسیوں جن ضابطہ شکنیوں اور آئین فراموشیوں کا ثبوت دیا ہے وہ اس حقیقت کی زندہ شہادتیں ہیں کہ ہم اس وقت زندہ قوموں کے زمرہ میں شمار ہونے کے قابل اور حکومت ومملکت کے مستحق کہلانے کے اہل قطعاً اور حتماً نہیں ہیں۔ لہٰذا غیروں کی حکومت سے نجات اور اس خطۂ زمین کی موہبت، محض انعاماً واحساناً ہوئی ہے جس طرح بنی اسرائیل کی، فرعون کی غلامی سے رہائی اور سینا کی وادیوں میں پرچم کشائی محض اعزازاً واکراماً ہوگئی تھی۔ اس کے لئے خدا کی طرف سے کیا اسباب وذرائع پیدا کئے گئے اور احوال وظروف کس طرح ایک خاص نہج وترتیب پر متشکل ہوتے چلے گئے۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ حقیقت یہی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے کہ یہ نتائج جو اس طرح مرتب ہوئے ہیں، ہماری استعداد واہلیت کا ماحصل۔ اور ہماری سعی وکاوش کا ثمرہ نہیں ہیں۔ یہ ہمیں بلا مزد ومعاوضہ اور بلا محنت ومشقت خدا کی طرف سے احساناً ملے ہیں، اور ملے اس لئے ہیں "لننظر کیف تعملون" (تاکہ دیکھا جائے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں) غیروں کی حکومت میں ہمیں وہ مواقع حاصل نہیں ہوسکتے تھے جو اس صالحیت کو پیدا کرسکیں جو وراثتِ ارض کیلئے بنیادی شرط ہے۔ یہ خطۂ زمین اپنی مواقع (Opportunity) کو ہم پہنچانے کیلئے عطا ہوا ہے۔ یہ کھلا میدان اس لئے دیا گیا ہے کہ لننظر کیف تعملون (تاکہ یہ دیکھا جائے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں)۔

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، صالحیت مشروط ہوتی ہے ایمان اور عمل صالح پر۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت میں ہے:

والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات لندخلنھم فی الصّٰلحین (۲۹/۹)

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور (اس کے ساتھ) صالح العمل ہوتے ہیں تو ہم ان کو یقیناً صالحین کے زمرہ میں شامل کرینگے۔

ایمان کے معنی ہیں زندگی کا متعین نصب العین۔ منتہائے نگاہ، مطمحِ نظر، منزلِ مقصود، اور اس نصب العین کے برسرِ حق ہونے پر

یقین محکم۔ اور اعمالِ صالح کے معنی ہیں؛ ایسا عملی پروگرام جو اس نصب العین کے حصول کے لئے ضروری صلاحیتیں پیدا کردے اور جس سے معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہوتی چلی جائیں۔

اس حقیقت کو قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ ایک برحق نصب العین کے حصول کی راہ پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کی روش ہے۔ اس میں بڑی بڑی تکالیف کا مقابلہ اور شدید مصائب کا سامنا ہوگا۔ مومن وہی ہے جو ان مصائب کو مردانہ وار برداشت کرے۔ جو اس راہ میں تکالیف سے جی چرائے، وہ مومن نہیں، قرآن کی رو سے منافق ہے۔ چنانچہ آیہ مندرجہ صدر کے ساتھ ہی فرمایا؛

ومن الناس من یقول اٰمنا باللہ فاذا اوذی فی اللہ جعل فتنۃ الناس کعذاب اللہ ولئن جاء نصر من ربک لیقولن انا کنا معکم اولیس اللہ باعلم بما فی صدور العلمین۔ ولیعلمن اللہ الذین اٰمنوا ولیعلمن المنفقین (۲۹/۱۰-۱۱)

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہوتی ہے کہ جب اللہ (کی راہ) میں دکھ اٹھانا پڑتا ہے تو لوگوں کی طرف سے آنے والی مصیبتوں کو اللہ کا عذاب سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر تیرے اللہ کی طرف سے نصرت آئے تو اس (فتح وکامرانی کے وقت) پکار اٹھتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا اللہ نہیں جانتا جو اہل جہان کے سینوں میں ہے؟ (ضرور جانتا ہے) اور اللہ یقیناً مومنین کو بھی دیکھ لے گا اور منافقین کو بھی۔

لہٰذا صالحیت کے لئے پہلی شرط جسمانی قربانی ہے اور دوسری شرط مالی ایثار جس کے متعلق فرمایا؛

وانفقوا من ما رزقنکم من قبل ان یاتی احدکم الموت فیقول رب لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق واکن من الصلحین (۶۳/۱۰)

اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اسے اس کے نظام کے قیام کے لئے کھلا رکھو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو اور وہ اسوقت کہے کہ یا اللہ! تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی تاکہ میں مال خرچ کرتا اور اس طرح صالحین میں سے ہو جاتا۔

ظاہر ہے کہ یہ اذیتیں اور مشقتیں مخالفین کے مقابلہ سے پیدا ہوں گی۔ یہ مخالفت دو اطراف سے ہوگی۔ ایک تو خارجی دشمنوں کی طرف سے جو اس امکانی قدرت کو بھی گوارا نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس خطۂ زمین پر خدا کے قانون کے مطابق حکومت متمکن ہو گئی تو ان کا باطل آگیں نظام سب کا سب درہم برہم ہو جائے گا۔ باطل اپنی بنیادی کمزوریوں سے خوب واقف ہوتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ نظام حق وصداقت کے قیام کی مخالفت میں پوری سعی وکاوش سے کام لیتا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!

مخالفت

لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کو سب سے پہلے ان خارجی اعدا کی مکارانہ سازشوں اور محاربانہ منصوبوں کے مقابلہ کیلئے ہر وقت مستعد رہنا ہوگا۔ اسلئے کہ اگر ان کی کمزوری یا لاپرواہی سے خدانہ کردہ ان کے مشئوم عزائم بروئے کار آگئے تو یہ امکانی قدرت جسے صالحیت یعنی وراثتِ ارضی کے حصول کا ذریعہ بننا ہے، یہیں ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اور کسقدر سوختہ سامان اور

شوریدہ بخت ہے وہ قوم، جس کی جھولی میں پڑی ہوئی ایسی متاعِ گراں بہا، اس طرح سے چھن جائے۔

خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے

ویلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیا

لیکن ان خارجی دشمنوں سے کہیں زیادہ شدید مخالفت خود اپنوں کی طرف سے ہوگی جو اس انقلاب سے اسلئے خائف ہوں گے کہ اس میں انھیں اپنی ملمع کارانہ سیادت اور ابلہ فریبانہ قیادت کی موت نظر آئے گی۔ یہی وہ گروہ ہے جو ہر زمانہ اور ہر قوم میں، ہر دعوتِ انقلابِ حق و صداقت کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے اور قرآن نے جسے مترفین کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ مترفین کے عناصر ترکیبی، ان کے نفسیاتی میلانات اور ذہنی رجحانات ان کے خصائص و لوازم ان کے مقاصد و عزائم کیا ہوتے ہیں، یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ سردست صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ مترف کے مفہوم میں تن آسان، سہل انگار، نفس پرست، عیش پسند، دوسروں کی کمائی پر آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کے عادی، سب داخل ہیں[1]۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ ہر رسول کی دعوتِ انقلاب کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا۔ انا بما ارسلتم بہ کفرون (۳۴/۳۴)

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر اس کے مترفین نے کہا کہ ہم تمہارے پیغام حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں۔

ہر داعیٔ حق و صداقت کا پیغام، انقلاب آفریں و حریت بخش ہوتا ہے۔ وہ انسانی ذہنوں کے تراشیدہ نظامہائے زندگی کو الٹ کر ان کی جگہ قوانینِ خداوندی کے مطابق نظامِ حیات قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام کے تمکن میں ان مترفین کو جو پشتہا پشت سے دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی نرم و نازک زندگی بسر کرتے چلے آتے ہیں، اپنے لئے پیغامِ موت نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی تن آسانیاں اور سہل انگاریاں انھیں کسی تبدیلیٔ حالات کے قابل نہیں چھوڑتیں۔ بنابریں ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس نہج و اسلوب پر قوم کا نظامِ معاشرت و تمدن چلا آرہا ہے اسی پر چلتا جائے۔

وکذالک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا۔ انا وجدنا اٰباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ اٰثارھم مقتدون (۴۳/۲۳)

اور اس طرح ہم نے (اے رسولِ عربی) تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا کہ اس کے مترفین گروہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو جس روش پر چلتے دیکھا ہے اسی کی تقلید میں ہم (نجات و سعادت کی راہ دیکھتے) ہیں۔

یہی وہ قوم کے اکابر ہیں جو ہر دعوتِ انقلاب کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز اٹھاتے ہیں اس لئے کہ انھوں نے اپنی ساحرانہ فسوں طرازیوں اور شاطرانہ فریب سازیوں سے قوم کو سکھایا ہی یہ ہوتا ہے کہ تم مرو تاکہ ہم زندہ رہیں، تم کماؤ تاکہ ہم تن آسانی کی

---

[1] قرآن نے بتایا ہے کہ قوم کا وراثتی دولت مند طبقہ اور مذہبی ملا اور پیر سب مترفین میں داخل ہیں۔ اس لئے قرآنی انقلاب کی مخالفت سرمایہ داروں، پیروں اور ملاؤں کی طرف سے ہوگی۔ (طلوعِ اسلام)

زندگی بسر کریں، تم دکھ جھیلو تاکہ ہم سکھ اٹھائیں، تم سنو تو ہمارے کانوں سے، دیکھو تو ہماری آنکھوں سے، سوچو تو ہمارے دماغوں سے، سمجھو تو ہمارے دلوں کی راہ سے، چراغ تمہارے ہوں راتیں ہماری، زبان تمہاری ہو اور باتیں ہماری، تمہارے پسینے سے ہمارے گلستانوں

مترفین کا گروہ

میں آبیاریاں ہوں اور تمہارے خون کی رنگینی سے ہمارے ایوانوں میں گلکاریاں، اس لئے ہر وہ تبدیلی جس میں ہر خاک غریب کیلئے سامانِ زیست میسر ہو اُن کیلئے پیامِ موت ہوتی ہے، لہذا ان کی طرف سے مخالفت یقینی۔ یہی ازل سے ہوتا آرہا ہے، یہی ابد تک ہوتا رہے گا۔ آج سے پانچ ہزار سال پیشتر جب صحنِ زمین میں سب سے پہلی مرتبہ یہ آواز حضرت نوحؑ کی زبان سے اٹھی تو ان ہی اکابر نے اس کی مخالفت کی

قال الملاء من قومہ انا لنرٰئک فی ضلٰل مبین (۷/۶۰)

اس کی قوم کے اکابر نے کہا کہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تو (اس دعوتِ انقلاب میں) ایک کھلی ہوئی گمراہی پر ہے۔

اسی پیغام کو جب حضرت ہودؑ نے دہرایا تو مخالفت کی اس صدائے بازگشت نے اس دعوت کی مزاحمت کی۔

قال الملاء الذین کفروا من قومہ انا لنرٰئک فی سفاھۃ وانا لنظنک من الکٰذبین (۷/۶۶)

اس کی قوم کے اکابر نے جنھوں نے اس دعوت کی صداقت سے انکار کیا تھا، کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ تو حماقت میں مبتلا ہے اور جو کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔

یہی وہ اکابرینِ قوم تھے جنھوں نے حضرت صالحؑ کی اس پکار کی مخالفت میں آواز اٹھائی۔

قال الذین استکبروا انا بالذی اٰمنتم بہ کٰفرون (۷/۷۶)

اس قوم کے مستکبرین نے کہا کہ جس بات پر تم ایمان لائے ہو ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔

یہی جواب حضرت لوطؑ کو ملا (۷/۸۲) اور اسی نہج سے حضرت شعیبؑ کی دعوتِ انقلاب کا استقبال ہوا۔ یہی وہ اکابر و جابرِ قوم تھے جنھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جھونک دینے کی ٹھانی تھی۔ اور یہی قوم فرعون کے وہ متکبرین و مترفین تھے جنھوں نے فرعون کو حضرت موسیٰؑ کے قتل کرنے کی صلاح دی تھی۔ یہی وہ سیادت و قیادت کے اجارہ دار تھے جنھوں نے جناب مسیحؑ کو حوالۂ دار و رسن کرنے کی سازش کی تھی۔ اسلئے کہ وہ خدا کی بادشاہت کو غریبوں کا حصہ بتاتے تھے اور یہی وہ رؤسا و امراءِ عرب تھے جنھوں نے تمام عمر اس دعوتِ آسمانی کی سخت ترین مزاحمت و مخالفت کی جو حکومت و سلطنت کی کنجیاں مترفین سے چھین کر متقین کو دینے کیلئے بلند ہوئی تھی یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہی ہوگا۔ اس خطۂ زمین پر جسے ہم پاکستان سے تعبیر کرتے ہیں جب اس انقلاب صحیحہ کی آواز اٹھے گی جو قوم میں صالحیت کا موجب بنے گا اور جس میں عزت و تکریم اور سیادت و امارت کے پیمانے بدل جائیں گے، تو اس کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز انہی مترفین کی طرف سے بلند ہوگی جو آج اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق از خود واجب الاحترام بنے بیٹھے ہیں اور جن کی کیفیت یہ ہے کہ یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳/۱۸۸) وہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ وہ (محض زبان سے کہتے ہیں لیکن) کرتے نہیں، اس کیلئے ان کی تعریف کی جائے۔ انھیں مستقلاً مسانیدِ عظمت و منابرِ عقیدت پر بٹھائے رکھا جائے۔ یہی وہ لوگ جن کی طرف سے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دینے والی ہر آواز کی مخالفت ہوگی۔ چونکہ اس زمانے کی فضا میں عہدِ کہن کے شخصی استبداد کو معیوب سمجھا جاتا ہے اسلئے سیاستِ حاضرہ[1] کے تقاضے

---

[1] خواہ یہ سیاست بے نقاب سامنے آئے یا مذہبی تقدس کا نقاب اوڑھ کر۔ (طلوعِ اسلام)

یہ ہیں کہ ان کی زبان سے تغلب و تفوق اور استیلاء و استبداد کی مخالفت کی جائے۔ لیکن نظام اس قسم کا قائم کیا جائے جس میں وہی تغلب و استیلاء موجود ہو۔ یعنی روح وہی ہے لیکن اس کے پیکر بدل چکے ہیں، لات و منات وہی ہیں فقط ان کے لباس میں تبدیلی آگئی ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

فلہٰذا، پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے یہ دوسرا مرحلہ پہلے سے بھی زیادہ ہمت طلب اور حوصلہ آزما ہے۔ اگر انھوں نے اس باب میں جرأت و بسالت اور ثبات و استقامت سے کام نہ لیا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکے گا کہ یہ بھی اسی قسم کی حکومت قائم کرلیں جیسی دنیا کی اور قومیں قائم کئے بیٹھی ہیں۔ لیکن یہ قرآنی استخلاف فی الارض نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی حکومت بہرحال و بہرکیف غیروں کی حکومت کے مقابلہ میں ہزار آئیں سود مند ہوتی ہے۔ اسلئے وہ زندگی، اس سے پیشتر کی زندگی سے یقیناً بہتر ہوگی۔ لیکن قرآنی زندگی نہ پہلے تھی، نہ یہ دوسری ہوگی۔ پہلی زندگی میں یہ معذوری تھی کہ ہمیں وہ امکانی مواقع میسر نہیں تھے جن سے ہم اپنے تصوراتِ صحیحہ کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرسکتے۔ لیکن اب امکانی قدرت کے میسر آجانے سے وہ بات تو باقی نہیں رہی۔ اب ہمارے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہ ہوگا کہ ہم نے اپنی زندگی کی عمارت کو قرآنی خطوط پر تعمیر کیوں نہ کیا۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے حکومت، مبدل بہ "استخلاف و وراثت" اسی صورت میں ہوتی ہے جب وہ اس نظام کے قیام کا ذریعہ بنے جسے خالقِ کائنات نے نوعِ انسانی کیلئے تجویز کیا ہے اور جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

الذین ان مکنٰہم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔ (۲۲/۴۱)

یہ (صالحین) وہ لوگ ہیں کہ جب ہم انھیں تمکن فی الارض عطا کریں گے تو وہ نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قائم کریں گے، معروف احکام نافذ کرینگے اور نواہی سے روکیں گے اور تمام امور کا آخری فیصلہ خدا کے قوانین کے مطابق ہوگا۔

نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ایسی محیط کل اور ہمہ گیر اصطلاحات ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے تبیین و تشریح اور تفصیل و توضیح کے لئے مستقل ابواب کی محتاج ہے۔ اس وقت صرف اتنا عرض کردینا کافی ہوگا کہ قرآنی نظام کی پوری کی پوری بساطِ حکومت ان چار گوشوں کے اندر سمٹ کر آگئی ہے، نظامِ صلوٰۃ ان میں عمودی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے درحقیقت وہ معاشرہ قائم ہوتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا کفیل اور عالمگیر نشوونما کا ضامن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مقام پر قرآن نے نظامِ صلوٰۃ کی اضاعت کو نعماءِ الٰہیہ کے چھن جانے کا موجب قرار دیا ہے۔ سورۂ مریم میں دیکھئے منعم علیہ حضرات (علیہم التحیۃ والسلام) کے تذکارِ جلیلہ کے بعد فرمایا

فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا۔ (۱۹/۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین ہوئے جنھوں نے نظامِ صلوٰۃ کو ضائع کردیا اور اپنی خواہشات ہی کی اتباع کرنے لگ گئے۔ سو وہ ہلاکت و بربادی کو پالیں گے۔

یہی ہیں وہ جن سے استخلاف فی الارض کی سی نعمتِ عظمیٰ چھن جاتی ہے اور کیسے سوختہ بخت ہیں وہ لوگ جن سے ایسی متاعِ عزیز اس طرح چھن جائے۔ وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباءو بغضب من اللہ۔

یہ ہے صالحیت پیدا کرنے کا نظام جس کا فطری نتیجہ وراثتِ ارض ہوتا ہے۔ اسے پیشِ نظر رکھئے اور پھر ایک نگاہ اپنے آپ پر ڈالئے اور ایسا کرتے وقت بنی اسرائیل کی اس واژگوں بخت قوم پر بھی نگاہ رکھئے جس کے مقدرات کے ڈوبتے ہوئے تارے ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں ان کی یہ حالت تھی کہ ذرا سی تکلیف آئی اور وہ لگے بڑبڑانے۔ کوئی بات خلاف منشا پیش آگئی اور وہ بیٹھ گئے منہ بسور کر۔ قدم قدم پر یہ طعن کہ ہمیں خواہ مخواہ مصر سے نکال کر لے آئے۔ اس سے تو ہم قوم فرعون کی غلامی میں اچھے تھے! اور یہاں کیا حالت ہے؟ اگلے دنوں میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ کالی جھنڈیاں لئے "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگاتے، جلوس کی شکل میں چلے جا رہے ہیں۔ ایک سے پوچھا کہ کیوں؟ کیا بات ہے؟ کہنے لگا "میاں! تین دن ہو گئے ہیں پانی کا نل بند پڑا ہے۔ کوئی سنتا ہی نہیں جہنم میں گیا ایسا پاکستان اور بھاڑ میں گئی اسلامی حکومت۔ کچھ وہاں مر گئے جو باقی رہ گئے ہیں یہاں مارے جا رہے ہیں" دیکھئے! یہ داستان کس طرح حرفاً حرفاً بنی اسرائیل کی داستان سے ملتی ہے اور قوم کس طرح ذراعاً ذراعاً اور شبراً شبراً ان کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ جس شخص سے بات کیجئے ایسا معلوم ہوگا گویا اس نے پاکستان میں آ کر کسی کی ہفت پشت جفتاد نسل پر احسان عظیم کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوم کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن ان مصیبتوں کی برداشت میں ان کی طرف سے کچھ اس قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ ہو رہا ہے گویا وہ یہ مصیبتیں کسی اور کی خاطر مفت میں جھیل رہے ہیں۔ انھیں قطعاً اس کا احساس نہیں کہ انھیں ایک ملک عظیم عطا ہوا ہے تاکہ وہ اس پر اپنی حکومت قائم کریں اور اگر انھوں نے ان مصائب و تکالیف کو ہمت اور حوصلہ سے برداشت کر لیا تو دنیا بھر کی سرفرازیاں اور سربلندیاں ان کے قدم چومیں گی۔ یہ عوام کا حال ہے۔ خواص کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس خطۂ زمین کے مل جانے سے سب کچھ مل گیا ہے اب کچھ کرنے کا کام باقی نہیں رہا۔ ہندوؤں کی یہ چند روزہ خوغہ آرائی ختم ہو جائے تو وہ تختِ جہانداری و سریر جہانبانی پر کامل امن و سکون سے متمکن ہو جائیں گے۔ وذالک الفوز العظیم۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر　　اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

یاد رکھئے! یہ خطۂ زمین بجائے خویش کوئی شے نہیں۔ نہ یہ اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے اور نہ ہی ہم اس کی مٹی میں دفن ہونے سے جنت الفردوس کے مستحق بن سکتے ہیں۔ یہ محفوظ اسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ آپ اپنے خون سے اس کی حفاظت و صیانت کا سامان بہم پہنچائیں اور پھر اس طرح محفوظ و مصئون ہونے کے بعد یہ جنتِ ارضی بھی اسی صورت میں متبدل ہو سکتا ہے جب آپ اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے اس پر خدا کی حکومت کا تختِ اجلال بچھائیں۔ وراثتِ ارض کا ابدی قانون صالحیت ہے اور خوف و حزن سے مامونیت و مصئونیت صرف اس کیلئے مقدر کی گئی ہے جو اپنے آپ کو قانونِ الٰہیہ کی حفاظت میں لے آئے اور اس طرح اصلح بن جائے۔

فمن اتقی و اصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (۷/۳۵)

پس جو کوئی اپنے آپ کو (قوانین خداوندی کی) حفاظت میں لے آئے اور اپنے اندر

صالحیت پیدا کر لے اس کے لئے نہ کوئی خوف ہے نہ غم۔

وذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

کہنے والے ہیں

سید جمال الدین افغانیؒ کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہ مرحوم

"اسلام اس کا سخت مخالف ہے کہ معتقدات کے معاملہ میں کورانہ تقلید کی جائے اور مذہبی فرائض کو رسماً ادا کر لیا جائے۔ اسلام نے جہالت اور تعصب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور انسانی عقل و فکر کو خواب سے بیدار کیا۔ اس نے کہا کہ انسان اس لئے نہیں بنایا گیا کہ کوئی دوسرا شخص اس کی مہار پکڑ کر اسے چلاتا جائے۔ وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ عقل و فکر اور علوم و فنون کی روشنی میں اپنی راہ نمائی آپ کرے۔ یعنی علوم فطرت (سائنس) اور تاریخی شواہد کی مشعل ہاتھ میں لیکر آگے بڑھتا چلا جائے۔ اسلام اس کا سخت مخالف ہے کہ جو باتیں ہمارے پاس ہمارے اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں انہیں بلا تحقیق و تنقید صحیح سمجھکر اختیار کر لیا جائے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ محض یہ بات کہ ایک شخص ہم سے پہلے گذر چکا ہے اس کی سند نہیں ہوسکتی کہ وہ شخص علم میں ہم سے بڑھ کر اور فہم و فراست میں ہم سے آگے تھا۔ فطری استعداد اور قلب و دماغ کی صلاحیتوں کے اعتبار سے اسلاف اور اخلاف میں کوئی فرق نہیں ہوسکتا۔

اس طرح اسلام نے انسانی فکر و بصیرت کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا جن میں وہ صدیوں سے جکڑے چلی آرہی تھی اور اسے کورانہ تقلید سے نجات دلا کر آزادی کی وہ فضائے بسیط عطا کر دی جس میں وہ اپنی جدوجہد سے اپنے لئے آپ فیصلے کر سکے۔ صرف اس شرط کے ساتھ کہ جو حدود قوانینِ خداوندی نے متعین کر دی ہیں، ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔ ان حدود کے اندر، انسانی علم و عقل پر کوئی پابندی نہیں عائد کی گئی۔ نہ ہی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹیں پیدا کی گئی ہیں۔"

(رسالۃ التوحید)

[کیا طلوعِ اسلام کی یہی دعوت نہیں جس کی وجہ سے اس پر کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں؟]

بہ نستعین

کوئی دن اور

(محترم عرشی صاحب)

میں ابھی کوئی دن اور جینا چاہتا ہوں، صرف اسلئے کہ ان تین کتابوں کا مطالعہ کر سکوں جن کی بشارت جولائی ۱۹۵۳ء کے طلوع اسلام نے سنائی ہے ان کے نام ہیں۔ نظامِ ربوبیت۔ معارف القرآن جلد ۵۔ لغات القرآن۔ مجھے ان کتابوں کے شائع ہوجانے کا عاشقانہ انتظار ہے۔ اسلئے کہ یہ نژاد نو کو قرآن مجید سے روشناس کرانے کا بہترین وسیلہ ہوں گی ـــــ وہ کتابِ حیات جس کو اس کے حاملوں نے آج تک بالعموم تعویذ گنڈا، جنتر منتر اور بے سمجھے ثوابِ تلاوت کا وسیلہ سمجھ رکھا ہے اور جو زیادہ ترقی کر گئے تو انھوں نے اسے اپنے اختلافی دنگل کا اکھاڑہ بنا لیا ـــ ان تینوں کتابوں کے متعلق وعدہ کیا گیا ہے کہ ان سے قرآن عظیم کی حقیقی عظمت اور انقلابی روح آشکارا ہوگی۔ اس کے چہرے سے اوہام کے نقاب اتار دیئے جائیں گے۔ اسوقت تک کی دنیا بھر کی علمی ترقیوں اور فکری کاوشوں کو اس کی آیات کے سامنے سربسجود ہونا پڑے گا۔ آئندہ زمانوں کے محققینِ قرآن اور مفکرینِ حیات کو ان کتابوں میں ایک راستہ ملے گا، جس پر چل کر وہ آگے بڑھیں گے اور انسانیتِ کبریٰ منزل سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔

ہاں تو میں ان کتابوں سے حقیقی استفادہ کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ سے اپنی زندگی میں کچھ اور مہلت مانگتا ہوں ـــــ مورخ لکھتے ہیں کہ ابو محمد اندلسی کہا کرتا تھا کہ "جنت کے سارے سامانِ تنعم پر میں جاحظ[1] کی کتابوں کو ترجیح دیتا ہوں" یہ اسلئے کہ جاحظ کی کتابیں بلاغت کے لحاظ سے قرآن مجید کے بعد اپنا نظیر نہیں رکھتیں لیکن یہ کتابیں جن کی امید پر میں اور جینا چاہتا ہوں، اپنی خصوصیاتِ زمانی کے لحاظ سے کہیں زیادہ اہم اور فائق ہیں۔ اسلئے میری یہ تمنا کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں۔ ہمارے اسلاف ؒ نے قرآن مجید کے متعلق ہمارے لئے نہایت قیمتی ذخیرے چھوڑے ہیں (شکر اللہ سعیہم) اس کے باوجود جب ہم اس غیر فانی کتاب کی ناقابل تلافی تصورِ عظمت وجلال کو دیکھتے ہیں تو کہنا پڑتا ہے ماقدروہ حق قدرہٖ۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ!　　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!

نزول قرآن کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ہمارے اکثر بزرگوں کی اعلیٰ ذہانتوں، عرق ریزیوں اور ان تھک کوششوں کا رخ قرآن سے ہٹ کر دوسری مختلف جہات کی طرف پھر گیا اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، ہماری اکثریت قرآن سے عملاً و فکراً دور ہوتی گئی اور غیر قرآنی مشاغل کو ذریعہ شرف و وسیلۂ نجات سمجھنے لگی ـــ قرآن میں ایک "امر" تھا اور اسی کو پکا کرنے کیلئے اس کے ساتھ ہی ایک "نہی" بھی تھی۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء

(ربانی کتاب کی پیروی کرو ـــ اور اس کے سوا کسی کی پیروی کی اجازت نہیں۔

---

[1] تیسری صدی ہجری کے وسط میں فوت ہوا۔ عربی زبان کا سب سے بڑا ادیب تھا۔

ہم نے ان دونوں نکتوں کو صرف ثوابِ تلاوت کیلئے رہنے دیا۔ سمجھنے اور عمل کرنے کی تکلیف نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری زندگی اور ہمارے فکر و عمل کے ہر شعبے پر من دونہ اولیاء چھاگئے اور "وانزل" غیر محسوس طور پر ہم سے چھنتا گیا۔ ہم ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، پس گئے، مٹ گئے، ذلت و خواری کی انتہاؤں کو جا پہنچے۔ لیکن اتنا سوچنے کی فرصت ہی نہ نکالی کہ ایسا کیوں ہوا؟ آخر وہ جو انتم الاعلون، کنتم خیر امۃ، امۃ وسطا کی قسم کے بہت سے مدحیہ الفاظ ہماری شان میں وارد ہوئے ہیں ہم ان کے کہاں تک مصداق ہیں، اور اگر نہیں تو کیوں؟

یہود و نصاریٰ نے ہم سے بہت بڑھ کر تورات و انجیل کی خدمت کی۔ ان کے مبینہ مقامات کی تشریح کیلئے جغرافیئے مضبوط کئے۔ واقعات کی تفہیم کیلئے تاریخ مرتب کی۔ رجال کے حالات و سنین دریافت کئے۔ بالغ نظر علماء کی مشترکہ کوششوں سے مستند تراجم تیار کرائے جو قریب قریب دنیا کی تمام قابل ذکر زبانوں میں پھیل گئے۔ ترجموں کی زبان ایسی فصیح و بلیغ رکھی گئی کہ اس پر الہام کا شبہ ہوتا ہے۔ پھر سادہ ترجموں کے علاوہ ایسے ترجموں کی بھی کمی نہیں جن کے حاشیے حوالوں سے مزین ہیں۔ یہ مختصر حاشیے محققین اور مصنفین کے لئے بے بہا نعمت ہیں۔ پڑھنے والا ایک ہی نظر میں سمجھ جاتا ہے کہ یہ ضخیم مجلد جو ۶۰ سے زائد صحیفوں اور بے شمار آیات پر مشتمل ہے۔ اس میں فلاں مضمون کتنی جگہ اور کہاں کہاں آیا ہے۔ بائبل کے پہاڑ، دریا، جھیلیں، شہر، گاؤں، میدان قدیم زمانے میں کہاں واقع تھے۔ آج ان کی کیا پوزیشن ہے۔ اس قسم کے بیشمار موضوعات پر بے شمار کتابیں، بے شمار زبانوں میں صرف بائبل کے متعلق ملتی ہیں ــــ اس کے برعکس جب ایک محقق قرآن پر ریسرچ کرنا چاہتا ہے تو اسے حصول مواد میں بے شمار دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ہمارے لٹریچر میں غیر اہم بلکہ لغو مواد اسرائیلیات، معجزات، ناسخ و منسوخ، شان نزول، اختلاف قرأت، اسرار و رموز، فتن اور باہمی آویزشوں پر تو لا متناہی ذخیرہ مل جائے گا لیکن کام کی چیز کیلئے "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کی منزل طے کرنا پڑے گی ــــ دور نہ جایئے۔ ہمارے موجودہ تراجم میں شاید ہی کوئی ایسا ترجمہ ہو جس کو بائبل کے تراجم کے سامنے لایا جاسکے۔ پھر قرآن مجید کے ارضی، سماوی اور بالخصوص انسانی علوم پر جو آیات آتی ہیں۔ ان پر ان مخصوص علوم کے ماہروں کی غائر توجہ کی ضرورت ہے۔ کوئی ایک مفسر جو صرف درس نظامی سے آگے کی کوئی خبر نہ رکھتا ہو۔ کس طرح ایسی جامع العلوم کتاب کو سمجھا اور سمجھا سکتا ہے ــــ لغت سب سے پہلی چیز ہے، جس کی مدد سے ہم کسی کتاب کے لفظی مفہوم سے آشنا ہوسکتے ہیں۔ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس باب میں ہمارے قدماء نے جو قابلِ قدر کوششیں کیں، بعد والوں نے ان کو چراغ راہ بنا کر آگے کوئی قدم نہیں اٹھایا اور ابدی کتاب کو محدود البشری، زبانی معلومات سے جکڑ دیا۔ آج ہمارے پاس کوئی لغت نہیں جو کسی اہل زبان نے زمانہ قریب نزول میں مرتب کیا ہو۔ دور دراز کے لوگوں نے صدیوں بعد اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ اس عرصے میں عالم اسلام پر غیر اسلامی اثرات کی گھٹائیں چھا چکی تھیں ــــ دین کے نام سے بہت زیادہ بے دینی پھیل چکی تھی۔ کسی بھی مصنف و مولف کا اس خارزار سے اپنے دامن کو بچا کر محفوظ نکل جانا سخت دشوار ہوچکا تھا ــــ اصل و نقل، حق و باطل اور جعلی و غیر جعلی بری طرح خلط ملط ہوچکے تھے، پھر باطل اور جعلی کی حمایت کیلئے تقدس کے عمامے اور حکومت کے لشکر کھڑے تھے۔ اس پر بعض لوگوں نے امکان بھر حق کی زبان کھولی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ لیکن باطل کا غلبہ بڑھتا ہی رہا۔ قرآن مجید کے ایسے الفاظ کی ایک فہرست تیار کی جاسکتی ہے جن کی

ماہیت تک پہنچانے میں ہمارے لغت نویس قاصر رہے ہیں۔ انھیں اپنے وقت کے مسلمانوں کے رسم و رواج سے متاثر ہونا پڑا ہے۔ اس باب میں امام راغب کا پایہ بہت بلند ہے۔ لیکن انھوں نے بھی کئی مفردات کو تشنہ چھوڑا اور آخر کتاب میں ان کی تشریح کا وعدہ کر کے آگے بڑھ گئے۔ پھر جب ہم آخر کتاب کو دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر نے امام صاحب کو مہلت نہیں دی کہ اس وعدے کو پورا کرتے۔ اس کے علاوہ کئی الفاظ کا لغوی مفہوم بتانے کے بعد "خص فی الشرع" کہہ کر اس کے روایتی اور فقہی معانی بیان کرتے ہیں۔ ایسا کرنے سے قرآنی اطلاق، تقیید سے بدل جاتا ہے۔ بعض مفردات ان سے چھوٹ بھی گئے ہیں۔ بعد کے اہلِ تحقیق کو لازم تھا کہ امام موصوف کی بنا کردہ عمارت کو تکمیل کی طرف آگے بڑھاتے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا ـــــ تاج العروس اور لسان العرب میں زوائد کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ نگاہِ تحقیق کو نتیجے تک پہنچنے کیلئے کئی جگہ رکنا اور ٹھٹکنا پڑتا ہے۔ پھر ان کتابوں تک ہر شخص کی رسائی بھی مشکل ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور سخت مشکل پیش آتی ہے   قرآن مجید میں بہت سے ایسے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو بظاہر مترادف معلوم ہوتے ہیں اور ترجمہ و تفسیر والوں نے ان کے لطیف فروق کو سمجھانے کی کافی کوشش نہیں کی۔ مثلاً ذنب، اثم، جناح، حوب اور کبیرہ کی قسم کے کئی الفاظ ہیں جن کا ترجمہ عموماً "گناہ" ہی کر دیا جاتا ہے۔ فضیحت، ذلت، خزی، ہوان وغیرہ کو ہر جگہ رسوائی و خواری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض موقعوں پر ایسے الفاظ بالکل پاس ہی پاس آجاتے ہیں مثلاً لوطؑ فرماتے ہیں ان ھٰؤلاء ضیفی فلا تفضحون واتقوا اللہ ولا تخزون۔ یہاں تفضحون اور تخزون کے ایک ہی معنی بتائے جاتے ہیں۔

اوپر جتنی باتیں عرض کی گئی ہیں اگر ہر ایک کی مثالیں تلاش کی جائیں تو یہ مضمون طویل ہو جائے گا۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن پر کام کرنے کی ابھی بہت ضرورت ہے اور قوم کی توجہ اس طرف نہ ہونے کے برابر ہے۔ ادارہ طلوعِ اسلام جو کچھ کر رہا ہے یہ فی الحال محض انفرادی کوشش ہے اور اس کا تکمیل پذیر ہونا بھی سرمائے کا محتاج ہے۔

مرا بہ تجربہ معلوم گشت آخرِ حال   کہ قدرِ مرد بعلم است و قدرِ علم بمال

مال، علم کا پیرو رہا ہے۔ مال نہ ہو تو صاحبِ علم اپنے خزانوں کو اپنے ساتھ ہی زیرِ زمین لے جاتا ہے اور نوعِ بشر اس سے محروم رہ جاتی ہے اور یہ بھی سخت مشکل ہے کہ ایک شخص دماغی کاوش میں بھی پگھلتا اور گداز ہوتا رہے اور کشکول لیکر پیسے مانگنے کے لئے بھی نکلے پھر کتابیں چھپوا کر ان کو فروخت کرنے کے ڈھنگ بھی خود ہی سوچے۔ ایسی بلند پایہ کتب کے مصنف کا ایک ایک لمحہ قوم کی ملکیت ہونا چاہیئے۔ وہ جو کچھ قوم کو حاضر و آئندہ نسلوں کیلئے دے سکتا ہے سپردِ قلم کر دے۔ پھر اس کی حفاظت و اشاعت کا انتظام قوم خود کرے۔ مصنف کے ذہن کو ایسی تشویشات سے بچا کر صرف ایک ہی مقصد کے لئے وقف رہنے دے۔

جہانتک میں سمجھتا ہوں، پرویز صاحب کا زیرِ تصنیف لغت ارتقائے لغت کی ایک قابلِ قدر مثال ہوگا اور اس مشکل کا حل کہ جہاں قدیم لغت نویسوں سے روایتی اثرات کی وجہ سے تسامح ہوا۔ آج کا لغت نویس اس سے کس طرح بچ سکے گا۔ اس کے متعلق ہم سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے صحفِ اولیٰ کے خلاف قرآن مجید کے الفاظ اپنی حفاظت میں لے لئے ہیں۔ الفاظ و عبارات کا اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہنا بہت بڑی نعمت ہے اور دوسری نعمت تصریف آیات ہے یعنی ایک مفہوم کو مختلف اسالیب میں

بیان کرنا اور ایک لفظ کو بعینہٖ یا اشتقاق کی مختلف شکلوں میں بار بار استعمال کرنا، اس انداز بیان سے بہت سی مشکلات آسانی سے حل ہو جاتی ہیں اور جو حل ہونے سے رہ جائیں وہ بھی آخر مزید تدبر سے اسی طریقے سے حل ہوں گی۔ قرآن کے بے شمار معجزات میں سے یہ بھی ایک معجزہ ہے جو روز بروز زیادہ سے زیادہ آشکارا ہوتا جائے گا۔ عام لغوی یا مترجم یا مفسر جو قرآن کے اندر جھانکنے کی بجائے اِدھر اُدھر کا زیادہ بھروسہ رکھتے ہیں وہ اس معجزے سے صحیح فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مجھے اطمینان اور مسرت ہے کہ پرویز صاحب کا اعتماد بہر خارجی مدد سے زیادہ قرآنِ عظیم کی داخلی رہنمائی پر ہے۔ اس لئے اس لغت کی قدر و قیمت روایات سے متاثرہ لغات کے مقابلے میں بہت بڑھ جاتی ہے۔ باقی رہیں بشری مساعی تو وہ بشر کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور اگر ان کا وجود نہ ہو تو ارتقا کے کوئی معنی ہی نہیں۔ جس قدر ہم اللہ کی کتاب سے قریب ہوتے جائیں گے، مساعیوں کی تاریکی چھٹتی جائے گی اور نورِ یقین میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

اب میں حرفِ مطلب پر آتا ہوں، ہمارے پاس پرویز صاحب کی شکل میں دماغ ہے، معلومات ہیں، وسعتِ تجربہ ہے اور سب سے بڑی چیز انتھک محنت بھی موجود ہے۔ اب ضرورت ہے ان عطیاتِ ایزدی سے فائدہ اٹھانے کی۔ اس کیلئے میرا یقین ہے کہ قارئین

ؑ یہاں مجھے تحقیق الفاظ و معانی کا ایک اور طریقہ یاد آیا جس کے اکسپرٹ شیخ عطا اللہ مرحوم وکیل گجرات تھے۔ جو سرسید کے صحبت یافتہ تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کے قریب قریب تمام الفاظ کے اضداد قرآن ہی سے تلاش کر لئے تھے۔ اس میں ان کو اتنا تبحر ملکہ اور رسوخ حاصل ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے قرآن فہم انکی رسائی ذہن پر دنگ رہ جاتے تھے۔ ان سے جب کسی لفظ کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ جھٹ سے ایک دو یا تین آیتیں پڑھ دیتے جن میں اسکے ایک دو یا تین اضداد نکل آتے۔ اس طرح فہم معنی میں قطعی سماوی روشنی حاصل ہو جاتی۔ وہ مروجہ کتب لغت میں سے کبھی کسی کا حوالہ نہیں دیتے تھے۔ ان کا سرمایۂ اعتماد و استناد قرآن اور صرف قرآن تھا۔ انھوں نے اس قسم کا ایک جامع لغت تیار کر کے اپنے انتقال سے تھوڑا عرصہ پہلے اس امید پر میرے حوالے کر دیا تھا کہ میں اسکی اشاعت کا انتظام کر سکوں گا لیکن ہزار افسوس بلکہ بے شمار افسوس کہ جہاں تقسیم ملک نے اور بہت سی تباہیاں مچائیں۔ یہ خزانہ الہام بھی ہم سے چھن گیا۔ قبل تقسیم میں نے اس کا کچھ نمونہ لکھ کر مولانا ابوالکلام صاحب کو بھیجا اور پوچھا تھا کہ ایسی کوئی کوشش پہلے سے موجود ہے یا نہیں؟ اور اگر نہیں ہے تو اس کی اشاعت کے متعلق آپ کیا مشورہ دیتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا تھا کہ "آج تک ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اسے ضرور شائع کرنا چاہئے لیکن اس سے کسی تجارتی نفع کی امید نہیں ہونی چاہئے۔ یہ صرف بلند پایہ اہل علم کے کام کی چیز ہے۔"

ناظرین طلوع اسلام چاہتے ہوں گے کہ ان کو اس کا کچھ نمونہ چکھایا جائے۔ اسلئے چند لفظ پیش کرتا ہوں۔ مثلاً زیر خط الفاظ کو نگاہ میں رکھئے۔

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ اثمہما اکبر من نفعہما۔ قد افلح من زکہا وقد خاب من دسہا۔ فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنی فسنیسرہ للیسری۔ واما من بخل واستغنی وکذب بالحسنی فسنیسرہ للعسری۔ لا یصلہا الا الاشقی ... وسیجنبہا الاتقی۔ لا صدق ولا صلی۔ ولکن کذب وتولی۔ بل تحبون العاجلۃ وتذرون الاخرۃ۔ وجوہ یومئذ ناضرۃ .... ووجوہ یومئذ باسرۃ۔ فاما الذین شقوا .... واما الذین سعدوا

ان آیات میں متضاد و متقابل الفاظ آپس میں ایک دوسرے کے چہرے سے پردہ اٹھا رہے ہیں۔ دیکھئے یسر و عسر۔ اثم و نفع۔ افلح و خاب۔ زکا و دسا۔ اعطی و بخل۔ اتقی و استغنی۔ صدق و کذب۔ یسری و عسری۔ یصلی و یجنب۔ اشقی و اتقی۔ صلی و تولی۔ تحبون و تذرون۔ عاجلہ و آخرہ۔ ناضرہ و باسرہ۔ شقوا و سعدوا۔

اس نظر سے قرآن مجید کی سیر کی جائے تو عجیب و غریب لطائف غیبی منکشف ہوتے ہیں اور بہت سی مشکلات یقینی طریقے سے حل ہو جاتی ہیں۔ میں نے لاہور کے ایک سرکاری اسلامی ادارے کے افسر کو توجہ دلائی تھی کہ لغات القرآن پر بہت کچھ کام کرنے کی ضرورت ہے آپ کو وسائل حاصل ہیں آپ اس طرف توجہ فرمائیں۔ انھوں نے میری گزارش کی اہمیت کا اعتراف تو کیا لیکن اعتراف سے آگے کچھ نہ فرمایا۔ یہ کام جماعتوں کے کرنے کے ہیں تنہا و بے وسیلہ افراد کے بس کی بات نہیں۔ پھر بھی لے دے کے نگاہ ایک ہی فرد پر پڑتی ہے جس نے آج تک اتنا قرآنی ذخیرہ تیار کر کے قوم کے آگے رکھ دیا ہے کہ ؎ "حیرت اندر حیرت اندر حیرت است" امید ہے کہ ہمارے زیر انتظار لغت میں اس تقابل و تضاد الفاظ کی صنعت کو بھی تا حدِ امکان ملحوظ رکھا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

عرشی

"طلوعِ اسلام" میں ایسے ذی ثروت اصحاب موجود ہیں جن میں سے ایک ہی صاحب تنہا اس بار کو اٹھا سکتے ہیں، پھر اگر وہ چاہیں تو کتابوں کی تکمیل و فروخت کے ساتھ ساتھ ان کی رقم بطورِ اقساط واپس بھی کی جا سکتی ہے اور اگر وہ آئندہ ایسے ہی اشاعتی کاموں کے لئے اس رقم کو وقف رہنے دیں تو مزید خیر ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ

کیا ہمارے حلقے میں کوئی بھی ایسا صاحبِ خیر نہیں

جو اپنے بچوں کے شادی بیاہ پر تو ہزاروں روپیہ خرچ کر سکتا ہو، اور عارضی، فانی، دنیوی خوشیوں، لذتوں اور عزتوں کے حصول کے لئے بڑی بڑی بازی لگا سکتا ہو ___ لیکن

خدا کی ابدی کتاب کی خدمت کے لئے

اس کے دل میں جرأت نہ ہو؟ میں سمجھتا ہوں، یہ ناممکن ہے۔ ابھی مسلمان اتنا بے حس اور مردہ نہیں ہوا کہ خدا کی کتاب کے نام پر اس سے اپیل کی جائے اور اس کا دل بالکل نہ پسیجے۔ کم سہی، کم تر سہی، ہم میں ایسے آدمی موجود ہیں جو آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے ہیں، وہ آگے بڑھیں اور اس متبرک بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیں۔

میں نے طلوعِ اسلام کے گزشتہ نمبر میں مشورۃً عرض کیا تھا کہ معاونین کے نام ماہ بماہ شائع ہوتے رہیں تاکہ رفتارِ کار کا اندازہ ہوتا رہے اور ترغیب و تشویق کا باعث بھی ہو۔ منیجر صاحب کا شکریہ کہ انھوں نے اسی نمبر میں اس پر عمل شروع کر دیا۔ اس سے مجھے ایک اور فائدہ پہنچا جس کا پہلے خیال نہیں تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جن شہروں کے دوستوں کے نام شائع ہوئے ہیں ان میں سے لاہور اور کراچی سے مجھے خاص تعلق و تعارف کا شرف حاصل ہے۔ لاہور کے جن سرگرم اور مخلص احباب کو میں جانتا ہوں ان میں سے ایک کا اسمِ گرامی بھی اس فہرست میں نہیں آیا۔ ایسے ہی کراچی کے بہت سے احباب ہیں جو طلوعِ اسلام کی خدماتِ قرآنی کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ان کے اسمائے گرامی اس فہرست میں غائب ہیں۔ خدا کرے کہ اگست نمبر میں جہاں یہ سطور شائع ہو رہی ہیں، ان کے ناموں کو دیکھنے کی مسرت بھی حاصل کر لوں۔ اور اگر اس نمبر میں بھی کوئی صاحب شریکِ حلقہ نہ ہو سکیں تو وہ ان سطور کو پڑھ کر ستمبر کی فہرست میں ضرور ہی شامل ہو جائیں۔ اس وقت بہت سے بے تکلف دوستوں کے پیارے چہرے میری چشمِ تصور کے سامنے ہیں۔ میں ان سے عرض کرتا ہوں کہ قبل اس کے کہ مجھے ان کی خدمت میں اس غرض کیلئے کوئی "بے تکلفانہ" اقدام کرنا پڑے خود ہی اپنا پیش کش لئے ہوئے آگے بڑھیں۔ میں آخر میں ایک دفعہ پھر یاد دلاتا ہوں کہ میں

نظامِ ربوبیت ـــ معارف القرآن جلد ۵ ـــ مفرداتِ قرآن

کی طباعت کے بعد ان کا مکمل مطالعہ کرنے کے لئے کوئی دن اور زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ (انشاء اللہ العزیز) اس امر میں آپ میری مدد کریں۔ خدائے تعالیٰ آپ کی مدد کرے ___ اس طرح بالواسطہ آپ موجودہ و آئندہ زمانوں کے محققینِ قرآن کی گراں بہا مدد کریں گے جو انجام کار آپ کی اپنی ہی مدد پر منتج ہوگی۔

عرشی

مرا نبی!

پرویز

انسانی زندگی میں بعض حوادث ایسے آتے ہیں جن کے تاثرات کو انسان خود تو محسوس کرتا ہے لیکن کسی کو نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا ہیں۔ وہ خود تو سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو سمجھا نہیں سکتا کہ اس کے دل کی کیا حالت ہے۔ یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جس کے اظہار سے خامہ انگشت بدنداں اور جس کے بیان سے ناطقہ سر بگریباں رہ جاتا ہے۔ وہ بار بار قلم اٹھاتا ہے۔ کچھ سوچتا ہے اور اس کے بعد ایک حرف لکھے بغیر اُسے رکھ دیتا ہے اسلئے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اس کیلئے اسے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ اور اگر کبھی ہمت کر کے کچھ لکھتا ہے تو اسے پڑھ کر خود ہی سر ہلا دیتا ہے کیونکہ اس کا اپنا اطمینان نہیں ہوتا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے وہ کہا گیا ہے۔ جو کچھ اس کے دل میں گذر رہی ہے وہ صفحۂ قرطاس پر آگئی ہے۔ یہ کچھ اس قسم کا مقام ہوتا ہے جس کے متعلق اصغرؔ نے کہا تھا کہ

ترے جلوؤں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھدی زبانِ بے نگاہ رکھدی، نگاہِ بے زباں رکھدی

بلکہ اس سے بھی کچھ مختلف مقام کیونکہ یہاں صرف حیرت نے یہ کیفیت پیدا کی ہے اور وہاں حیرت کے ساتھ سوز و گداز بھی ہوتا ہے۔ وہاں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ سینہ، جذبات کی تلاطم خیزیوں سے طلسمِ پیچ و تاب بن رہا ہے لیکن ان شورانگیز طغیانیوں کی آواز لبِ ساحل تک نہیں آسکتی۔ دل شدتِ احساسات سے ہمہ تن آگ ہے لیکن اس کوہِ آتش فشاں کا دہانہ کچھ اس طرح مختوم ہے کہ شعلہ و شرر تو ایک طرف اس کا دھواں تک بھی باہر نہیں آنے پاتا۔ اگر اس کی نگاہوں کی حیرت، لبوں کی تھرتھراہٹ اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ اس کے دل کی غمازی نہ کردے تو کسی کو محسوس تک نہیں ہو سکتا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔

اسوقت میرے دل کی بعینہٖ یہی حالت ہے اور یہ حالت ہوئی ہے اخی محترم عرشیؔ صاحب کے اس سادہ و رنگین شذرہ کا پہلا فقرہ پڑھنے سے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ وہ

کچھ دن اور جینا چاہتے ہیں تاکہ میری تین (زیرِ ترتیب) تصانیف کا مطالعہ کر سکیں۔

آپ شاید حیران ہوں کہ ان الفاظ میں بالآخر وہ کونسی بات ہے جس نے میرے دل کی یہ حالت کر دی ہے۔ آپ شاید اس پر بھی متعجب ہوں کہ جو شخص اتنی اتنی ضخیم کتابیں تصنیف کر لیتا ہے اور ایسے ایسے طویل مقالات لکھ ڈالتا ہے اس کیلئے کیا مشکل ہے کہ جو کچھ اس میں گذر رہا ہے اسے صفحۂ قرطاس پر لے آئے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان الفاظ نے میرے دل کی جو حالت کر دی ہے میں اس کی خفیف سی جھلک بھی الفاظ کے ذریعے نہیں دکھا سکتا۔

عرشی صاحب میرے ان کرم فرماؤں میں سے ہیں جن کی خود ساری عمر قرآن کے مطالعہ میں گذری ہے وہ اس کی آرزو کرتے ہیں (اور جس والہانہ شوق سے آرزو کرتے ہیں وہ ان کے اندازِ تحریر سے ابل رہا ہے) کہ وہ کچھ دن اور زندہ رہیں تاکہ میری قرآنی فکر کے نتائج ان کے

سامنے آسکیں! میں اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ

گہ برگوشۂ دستار داری خوشا بختِ بلندِ باغباناں!

حقیقت یہ ہے کہ جن دلوں میں قرآن سے عشق اور جن نگاہوں میں اسکی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے ان میں اسقدر وسعتِ ظرف اور کشادگیٔ داماں آجاتی ہے کہ انھیں کسی کی قرآنی فکر کا قطرۂ شبنم بھی یم بے کنار بن کر دکھائی دیتا ہے اور وہ انہی پیمانوں سے اس کی قدرافزائی بھی کرتے ہیں لیکن دیکھنے والی نگاہیں دیکھ لیتی ہیں کہ

شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

عرشی صاحب کے یہ الفاظ میرے سامنے اس واقعہ کی تصویر لے آئے جس کی یاد میرے لئے شادابیٔ قلب ونظر کے ہزار جنت بداماں ساماں اپنے اندر رکھتی ہے۔ شمس العلماء حافظ محب الحق مرحوم سے قارئین طلوع اسلام ناواقف نہیں۔ ان کا تذکارِ جلیلہ کئی بار ان صفحات کو کہکشاں زار بنا چکا ہے۔ انھوں نے کم ازکم ساٹھ ستر برس مسلسل ومتواتر خالص قرآن کے مطالعہ میں گذارے۔ ان سے میرا غائبانہ تعارف تو بہت پہلے سے تھا لیکن جب وہ تقسیم ہند کے بعد کراچی تشریف لائے ہیں تو بہت سن رسیدہ ہو چکے تھے۔ اس پر طرح طرح کے عوارض جن سے کمزوری دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔ اس زمانے میں معارف القرآن کی چوتھی جلد (معراجِ انسانیت) کی طباعت کے انتظامات میرے پیش نظر تھے۔ میں جب بھی حاضر ہوتا سب سے پہلا سوال یہ ہوتا کہ کتاب کے چھپنے میں ابھی کتنی دیر ہے؟ فرماتے کہ "میں نے اللہ میاں سے دعا کی تھی کہ مجھے اتنی مہلت دیدی جائے کہ میں معراجِ انسانیت کا مطالعہ کرلوں۔ اب صورت یہ ہے کہ میری عمر تو پوری ہو چکی ہے لیکن میری دعا کی وجہ سے مجھے توسیع (Extension) ملتی جاتی ہے۔ مجھے اس توسیع کیلئے بار بار درخواست پیش کرتے ہوئے ندامت سی محسوس ہوتی ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ کتاب کی طباعت میں دیر نہ لگے"۔ ایک دن بیٹھے تھے کہ ڈاکیہ خط لایا۔ آپ نے خط اپنے منشی کی طرف بڑھا دیا کہ پڑھ دیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ اب خود خط نہیں پڑھ سکتے۔ فرمایا "میری ایک آنکھ تو مدت ہوئی ضائع ہو گئی تھی صرف ایک آنکھ میں تھوڑی سی روشنی باقی ہے۔ اسے میں نے سنبھال کر (ریزرو) رکھ چھوڑا ہے کہ معراجِ انسانیت پڑھ سکوں"۔ جب کتاب چھپ گئی تو ایک دن فرمایا کہ میں نے معراجِ انسانیت کو لفظاً لفظاً پڑھ لیا ہے۔ پھر کہا کہ میں نے یہ بات محض محاورہ کے طور پر نہیں کہی بطور واقعہ بیان کی ہے۔ بات یہ ہے کہ جب کتاب آئی ہے تو میری بینائی اسقدر کمزور ہو چکی تھی کہ عینک سے بھی کچھ پڑھا نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے آتشی شیشہ منگایا، لیکن وہ ایسا تھا کہ اس میں بیک وقت صرف ایک لفظ ابھر کر سامنے آسکتا تھا۔ میں نے اس طرح ایک ایک لفظ کر کے ساری کتاب ختم کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے گلے سے لگایا۔ پیشانی کو چوما۔ سینکڑوں دعائیں دیں۔ وہ دعائیں دے رہے تھے اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

اس کے تھوڑے عرصے بعد آپ وفات پاگئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

آج عرشی صاحب کے الفاظ سے اس واقعہ کی یاد پھر میرے لئے جنتِ نگاہ بن گئی اور پھر سے میرے دلِ دردمند کا آبگینہ چھلک پڑا۔

فرشتے پونچھ لیتے ہیں میرے رخسار سے آنسو   الہٰی آج کس کی یاد میں شبنم فشاں ہوں میں

حقیقت یہ ہے کہ انہی حضرات کی عاجز نوازیاں اور ہمت افزائیاں تھیں جن سے میں نے اسقدر نامساعد حالات میں ایسے سنگلاخ مراحل کو اس طرح طے کر لیا کہ آج جب میں اس قطع کردہ منزل پر نگہ بازگشت ڈالتا ہوں تو محو حیرت رہ جاتا ہوں کہ یہ تمام راستہ میں نے کس طرح طے کر لیا؟[1]

عرشی صاحب کے اس فقرے نے میری ان عظیم ذمہ داریوں کے احساس کو تیز تر کر دیا جو میں نے نژاد عصر حاضر کے سامنے قرآن پیش کرنے کے ارادے سے اپنے سر لے رکھی ہیں۔ میں لرزتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بدرگاہ رب العزت التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنے کرم بے پایاں کے تصدق مجھے وہ توفیق عطا فرما دے کہ میں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکوں اور اس کے مخلص بندوں نے جو توقعات مجھ سے وابستہ کر رکھی ہیں، ان پر پورا اتر سکوں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

عرشی صاحب کی آرزو ہے کہ وہ جیتے جی ان تین کتابوں کا مطالعہ کر سکیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ آرزو پوری ہو جائیگی۔ واللہ المستعان۔
لیکن میں اپنی آرزو کے متعلق کیا کہوں جو میری زندگی کا آخری سرمایہ ہے۔ میری آرزو یہ ہے کہ میں اس نظام ربوبیت کی ایک جھلک اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں جس کی جلوہ باریوں سے (قرآن کہتا ہے کہ) زمین جگمگا اٹھے گی۔
اور اگر یہ میرے نصیب میں نہیں تو کم از کم میں اس نظام کے پیغام حیات بخش کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچا سکوں تاکہ انسانیت سمجھ تو لے کہ اس کے دکھوں کا علاج کیا ہے۔

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو   اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر

اور اگر میں ایسا ہی سوختہ بخت ہوں کہ یہ بھی میرے مقدر میں نہیں تو کم از کم رفقاء کا ایک حلقہ ہی ایسا مل جائے جو میرے سرمایۂ تدبر و تفکر اور متاع سوز و گداز کے وارث بن جائیں۔ تاکہ مرتے وقت مجھے اس کا اطمینان تو ہو جائے کہ یہ دیا جسے میں نے اپنے خون جگر سے روشن رکھا ہے اسی طرح جلتا رہے گا۔

لیکن جس بدنصیب کو ابھی تک ان میں سے کسی آرزو کے پورا ہونے کی امید دکھائی نہ دیتی ہو
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

لیکن یہ میری بھول ہے۔ یہ بیتابیٔ تمنا کی دست درازی ہے جو نتائج کو اپنے پیمانوں کے مطابق کھینچ کر سامنے لانا چاہتی ہے حالانکہ نتائج خدا کے اس قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں جن میں جذبات کو کوئی دخل نہیں۔ ہمیں کام سے غرض ہونی چاہیئے، نتائج کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھنے سے نہیں۔ جہ عجب کہ دیار عشق میں اتنی سی "خود غرضی" کو بھی "سودا بازی" پر محمول کیا جائے!

بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے   مقام سود و زیاں آ گیا ہے دیوانے

پرویز

---

[1] اس وقت حضرت علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی کی اسی قسم کی کشادہ دلی اور ذرہ نوازی کے کئی واقعات میری آنکھوں کے سامنے آ رہے ہیں لیکن یہ داستان تفصیل طلب ہے۔ اسے کسی دوسری فرصت میں پیش کروں گا۔

رفتارِ عالم

سالِ رواں میں بین الاقوامی سیاست کا عظیم ترین واقعہ اسٹالین کی موت ہے۔ اس کے نتائج نہایت دوررس ثابت ہوسکتے ہیں، خلاف توقع اس کے اثرات چند دنوں میں ہی نمودار ہونے شروع ہوگئے۔ کمیونزم سے متعلق اس بنیادی حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ لینن اور سٹالین نے ہی اسے نظام کی صورت میں متشکل کیا۔ کمیونزم کی رفتار کا مطالعہ کرنے سے یہ امر بخوبی روشن ہوجاتا ہے کہ یہ نظام ترویج و بقا میں شخصیتوں کا محتاج ہے۔ اگر لینن کے بعد سٹالین برسرِ اقتدار نہ آتا تو عین ممکن تھا کہ اسوقت اس کا شیرازہ بکھر جاتا۔ سٹالین کی موت سے یہ نظام ایک مضبوط شخصیت سے محروم ہوگیا ہے جس نے نہایت چابکدستی سے عناصر مختلفہ کو مرکوز و یکجا رکھا چنانچہ اندرونی اضمحلال و انتشار کے آثار نمایاں طور پر نظر آنے شروع ہوگئے ہیں۔ ہرچند یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ یہ عناصر آناً فاناً پریشان ہوجائیں گے لیکن اگر کمیونزم کو اسٹالین جیسا مردِ آہنی میسر نہ آیا تو اس نظام کا سنبھالنا از قبیلِ محالات ہوجائے گا۔ یوں بھی جو نظام شخصیتوں کا محتاج ہوتا ہے وہ ان سے محروم ہوکر زیادہ دیر تک چل نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے شخصیتوں کے مقابلے میں نظام کی حرکت پر زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن کمیونزم کے نظام میں وہ قوت موجود ہی نہیں جو شخصیتوں سے بے نیاز ہوکر اپنے بل بوتے پر قائم رہے اور آگے بڑھ سکے۔ اسلئے کہ اس میں وہ جذبۂ محرکہ نہیں ملتا جس کی بنا پر ایک انسان اپنی محنت کا ماحصل بطیبِ خاطر دوسروں کی پرورش کیلئے دیدے۔ اس نظام کو استبداد کے زور ہی سے قائم رکھا جاسکتا ہے۔ اپنے زورِ دروں سے صرف قرآن کا نظام ربوبیت چل سکتا ہے۔

روس کا داخلی خلفشار

سٹالین کی موت کا جو فوری اثر روس کی داخلی سیاست میں نمودار ہوا اس سے بلاخوف تردید یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ یہ نظام اتنا مستحکم نہیں جتنا کہ بتایا جاتا تھا۔ نیز اس میں اہم تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ سٹالین کے حینِ حیات میں کوئی ڈیڑھ درجن یہودی ڈاکٹر اس جرم میں ماخوذ ہوئے تھے کہ انھوں نے بطور سازش روس کے ممتاز لیڈروں کو غلط دوائیاں دے کر مار ڈالا۔ جیسا کہ روس میں دشمن ملک سرگرمیوں سے متعلق مقدمات کا دستور ہے اس مقدمے میں بھی یہ اعلان ہوا کہ ماخوذین نے اقبالِ جرم کرلیا ہے۔ اس سازش کا انکشاف ایک لیڈی ڈاکٹر کی وساطت سے ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی خدمات کے سلسلے میں اسے آرڈر آف اسٹالین کا تمغہ بھی عطا کیا گیا۔ سٹالین کی وفات کے فوراً بعد ہی دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ تمام ماخوذین رہا کردیئے گئے اور جس عورت نے ان کو اسیر کرایا تھا اس سے تمغہ بھی واپس لے لیا گیا۔ کمیونزم کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا اور یہ اسٹالین کی موت کے بعد ہی ہوسکتا تھا۔ ورنہ خود اسٹالین نے جس بے دردی، سفاکی اور بے دریغی سے اپنے مخالفین کو موت کے گھاٹ اتارا وہ ایک نہایت ہی لرزہ خیز و خونچکاں داستان ہے۔ اس ناقابلِ یقین

اقدام کی ایک وجہ یہ سمجھی گئی تھی کہ ڈاکٹروں کی مبینہ سازش کی کامیابی میں پولیس کی غفلت کو بھی دخل تھا۔ اس کا اثر پولیس کے ناظم اعلیٰ بیریا (Beria) کی شہرت پر پڑتا تھا جو سٹالین کے بعد پولیس کی نظامت اعلیٰ سے ابھر کر وزیر داخلہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ یہ خیال کیا گیا کہ چونکہ اب بیریا کو مالنخوف کے عہد حکومت میں نمایاں حیثیت حاصل ہے اسلئے اس نے اپنے محکمہ پر سے یہ دھبہ دھونے کیلئے تمام ڈاکٹروں کو رہا کر دیا ہے تاکہ دنیا یہ سمجھے کہ یہ سازش ہی غلط تھی اور پولیس کی غفلت یا نا اہلیت کا اس میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک طرف بیریا کی یہ پوزیشن سمجھی جاتی تھی اور دوسری طرف یہ محیر العقول واقعہ رونما ہوا کہ اسی بیریا کو ملک کا سب سے بڑا دشمن سمجھ کر گرفتار کر لیا گیا۔ یہ غور طلب ہے کہ بیریا بیس سال سے کمیونسٹ جماعت کا معتمد کارکن اور سٹالین کا قریبی دوست متصور ہوتا چلا آرہا ہے اور روس کی حفاظتی پولیس کا کوئی پندرہ سال تک ناظم اعلیٰ رہا ہے۔ ایسے شخص کا یوں اقتدار سے محروم کر دیا جانا اور ایسے جرم میں ماخوذ ہونا جس کی سزا گولیوں کی بوچھاڑ ہے، نہایت غیر معمولی واقعہ ہے اور گہری تبدیلیوں کا پیش خیمہ۔

بیرون ملک سٹالین کی موت کے نمایاں اثرات نمودار ہوئے۔ یہ ظاہر ہے کہ داخلی خلفشار کے پیش نظر روس کے لئے ضروری ہے کہ بیرونی معاملات میں وہ کم سے کم الجھے تاکہ اسے داخلی معاملات کو سلجھانے کا موقع مل سکے۔ یہ صورت گفتگوئے امن سے ہی ممکن تھی۔ چنانچہ امن کے دعاوی خاصے شدید ہوگئے۔ سٹالین نے اپنی موت سے چند ماہ پیشتر یہ شوشہ چھیڑا تھا کہ وہ امریکہ کی نئی قیادت سے گفتگوئے صلح کے لئے تیار ہے۔ آئزن ہاور نے صدارت کا انصرام سنبھالتے ہی اس کا جواب دیا کہ وہ اس ملاقات کیلئے تیار ہے بشرطیکہ سٹالین امن پسندی کا عملی ثبوت دے۔ روس نے اس کا ایک حد تک عملی ثبوت دیا۔ جرمن اور آسٹریا، دو بدقسمت ملک جو گذشتہ سات آٹھ سال سے چار بڑی طاقتوں کے قبضے میں چلے آرہے ہیں اور ابھی تک ان کے معاہدۂ امن کا تصفیہ نہیں ہو سکا، ان سے متعلق روس نے ازسر نو مذاکرات جاری کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ جرمنی میں روسیوں نے برطانیہ کے جو جہاز گرا لیے تھے ان کے متعلق بھی انھوں نے نمایاں طور پر مصالحت جوئی کا ثبوت دیا۔ اس کے علاوہ کوریا میں بھی انھوں نے متارکہ کی گفتگو میں پہلے سے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا جو اثر مغربی سیاست پر پڑا اس کا تذکرہ ذرا آگے چل کر آئے گا۔

روس کے ماتحت ملکوں میں بغاوت

سٹالین کی موت کا ایک اور حیران کن نتیجہ ان ممالک میں نکلا جو کمیونزم کے زیر اقتدار ہیں۔ سب سے پہلے مشرقی برلن میں بغاوت کے شعلے بھڑکے۔ وہاں محنت کشوں نے روسی اقتدار کے خلاف سرکشی کی اور تعجب ہے کہ اس کی بغاوت کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے حالات اچھے نہیں، انھیں تنخواہیں کم ملتی ہیں اور کام ضرورت سے زیادہ لیا جاتا ہے۔ کمیونزم کے نظام میں محنت کشوں کا یہ شکایت کرنا اس پروپیگنڈے کی قلعی کھولنے کیلئے کافی ہے کہ اس نظام نے مزدوروں کے لئے جنت آباد کر دی ہے۔ اس بغاوت کا دوسرا حیرتناک پہلو یہ تھا کہ روسی نظام میں زبردست سنسر کے باوجود یہ خبر فوراً اطراف واکناف عالم میں پھیل گئی۔ بہرحال گو بغاوت کو فرو کر دیا گیا لیکن فوجی طاقت سے ہی ایسا کیا جا سکا۔ یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے کہ اس زلزلے کے تمام جھٹکے محسوس ہو چکے ہیں۔ ابھی اس کا عمل جاری ہے اور نتیجے کا انتظار۔ مشرقی برلین کے بعد تمام مشرقی جرمنی میں بغاوت پھیل گئی۔ پولینڈ میں بھی علیٰ ہذا القیاس روسیوں کے خلاف کافی تشدد کا مظاہرہ

کیا گیا۔ ان سب سے بڑھ کر سنسنی خیز واقعات ہنگری میں وقوع پذیر ہوئے۔ وہاں ایک یہودی النسل ناگی نامی نے روکوسی نامی وزیرِاعظم کو وزارت سے سبکدوش کر کے خود اختیارات سنبھال لئے اور وزارتِ عظمیٰ پر قبضہ کرتے ہی بہت سے کمیونسٹ اصولوں کے خلاف احکام صادر کر دیئے۔ مثلاً اس نے شخصی زراعت و شخصی دکانداری کی اجازت دیدی۔ نیز ہنگامی قید خانے ختم کر دیئے اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ سابقہ حکومت کی پالیسی متعلقہ مذہب، صنعت، زراعت، شخصی ملکیت، انفرادی آزادی وغیرہ یکسر غلط تھی۔ کیا یہ اشتراکی اصولوں کے خلاف کامیاب بغاوت ہے؟ اس کا جواب وقت دے گا۔

مذاکراتِ امن

امن کی جو گفتگو سٹالین نے آخری ایام میں شروع کی تھی اس کا نقطۂ ماسکہ کوریا تھا۔ کوریا میں تین سال کی لڑائی لڑی جا رہی ہے اور کوئی ایک سال سے جنگ و امن دوش بدوش جا رہے ہیں۔ پچھلے دنوں مذاکرات امن ایک یقینی منزل میں داخل ہوئے۔ پہلے فریقین اس پر راضی ہوئے کہ بیمار اور زخمی قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ اس تبادلے نے منزلِ امن قریب تر کر دی۔ لیکن دوسرے قدم پر کئی لغزشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اب فریقین کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ بقایا قیدیوں کا فیصلہ کیسے کیا جائے۔ امریکہ کا اصرار یہ تھا کہ شمالی کوریا اور چین کے جو قیدی ان کے قبضہ میں ہیں اگر وہ برضا و رغبت اپنے گھروں کو واپس جانا چاہیں گے تو انھیں کمیونسٹوں کے حوالہ کیا جائے گا، ورنہ ایسا نہیں کیا جائے گا۔ کمیونسٹ اب تک اس مطالبے کو رد کرتے چلے آرہے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہ وقار کا سوال ہو گیا تھا۔ ان کے آدمیوں کا واپسی سے انکار اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کمیونسٹ نظام کو لعنت سمجھتے ہیں۔ کمیونسٹ یوں تو یہ پوزیشن قبول نہیں کر سکتے تھے، لیکن اب کے انھوں نے یہ تلخ گولی بھی نگل لی اور اس شرط کو قبول کر لیا۔ البتہ معاملہ یوں طے ہوا کہ جو قیدی جانبین سے اپنے اپنے گھروں کو واپس جانا چاہیں انھیں فی الفور رہا کر دیا جائے اور جو رضامندی کا اظہار نہ کریں انھیں پنج قومی کمیشن کے سپرد کر کے اشتراکیوں کو موقع دیا جائے کہ وہ ان سے مل کر انھیں اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے پر رضامند کریں اور اگر وہ ایک ماہ کے اندر رضامند نہ ہوں تو انھیں آزاد کر دیا جائے۔ ادھر یہ تصفیہ ہوا ہی تھا کہ ادھر ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس سے سارا کھیل درہم برہم ہوتا نظر آیا۔ جنوبی کوریا کے صدر ڈاکٹر سنگھمن ری نے یہ شوشہ چھیڑا کہ وہ کسی ایسے متارکہ کو تسلیم نہیں کرے گا جو تمام کوریا کو متحد نہ کرے اور اشتراکی فوجوں کو کوریا کے کسی حصے میں رہنے کا موقع دے۔ یہ مطالبہ ضد پر مبنی تھا کیونکہ ان امور کا تصفیہ اس مجلس سیاسی کا کام ہے جو جنگ بند ہونے کے بعد منعقد ہوگی۔ ڈاکٹر ری نے اس مسئلہ پر کچھ ایسا واویلا مچایا کہ صدر امریکہ کو بذاتِ خود اس سے اپیل کرنی پڑی کہ وہ اس ضد سے باز آجائے۔ دونوں صدروں کی باہمی مراسلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ری نے یہ مطالبہ کیا کہ امریکہ جنوبی کوریا سے ایک دفاعی معاہدہ کرے اور یہ ضمانت دے کہ اشتراکی پھر سے جنوبی کوریا پر حملہ آور نہیں ہونگے نیز امریکہ جنوبی کوریا کی معاشی بحالی میں مناسب امداد دے۔ یہ مذاکرات طے ہو ہی رہے تھے کہ ری نے یہ حیرت انگیز اقدام کیا کہ کم و بیش پچیس ہزار اشتراکی قیدیوں کو اقوامِ متحدہ کی مرضی و مشورے کے بغیر رہا کر دیا۔ امریکی فوجوں نے بعض قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنایا اور چند ایک کو گرفتار بھی کیا لیکن ان کی تعداد مٹھی بھر سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ اشتراکی اس غیر معمولی اقدام پر بہت برافروختہ ہوئے۔ انھوں نے امریکہ پر الزام لگایا کہ قیدی اس کے اغماز سے رہا ہوئے اور مطالبہ کیا کہ انھیں پھر سے مہیا کیا جائے۔ قیدی رہا کئے جانے کا

ذمہ دار کوئی بھی ہو۔ سنگمن ری نے تو اعلانیہ کہہ دیا تھا کہ اس نے یہ اقدام تنہا اپنی ذمہ داری پر کیا ہے۔ ان کا پھر سے گرفتار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ چنانچہ ایک طرف مشرق بعید کے اعلیٰ کمانڈر جنرل مارک کلارک ٹوکیو سے اڑ کر کوریا آئے اور اشتراکی نمائندوں سے ملے اور دوسری طرف صدر آئزن ہاور کا ایک نمائندہ ری سے ملنے کے لئے آپہنچا۔ ان دوگونہ گفتگوؤں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اشتراکیوں نے پھر سے مذاکرات صلح شروع کر دیئے اور ری نے بھی یہ وعدہ کر دیا کہ وہ عارضی طور پر معاہدۂ صلح کی پابندی کرے گا۔ اس طرح گو حالات بظاہر سدھر گئے ہیں لیکن موقع کی نزاکت بدستور باقی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ معاہدہ صلح میں کیا کیا موانعات پیش آئیں گے۔ [ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ معاہدۂ امن کی تکمیل ہو گئی ہے۔]

دول اربعہ کی کانفرنس

امن کی فضا پیدا کرنے میں روس کے پیش نظر ایک اور مصلحت بھی تھی۔ وہ امن کی باتیں کر کے اقوام مغرب کی جنگی تیاریوں میں سستی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ نیز ان میں اختلافات کے بیج بونا چاہتا ہے وہ جانتا ہے کہ جونہی امن کا چرچا ہوگا اقوام مغرب اپنی حکومتوں سے مطالبہ کریں گی کہ وہ جنگی مساعی کو کم کر دیں اور بیش از بیش توجہ امن قائم کرنے میں صرف کریں۔ اس طرح ان کے عسکری منصوبوں کے بروئے کار آنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ انگلستان اور ایک حد تک فرانس میں روس کی گفتگوئے امن کا خیر مقدم کیا گیا۔ چرچل نے اصرار سے کہا کہ سٹالین کی موت روس کی پالیسی میں زبردست تبدیلیوں کا پیش خیمہ ہے لہٰذا اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی یہ صورت ہے کہ روس، امریکہ اور انگلستان کے اعلیٰ قائدین آپس میں ملاقات کریں۔ روس میں چرچل کی اس تجویز کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا لیکن امریکہ نے بڑی سرد مہری کا ثبوت دیا۔ صدر آئزن ہاور نے پھر اصرار کیا کہ خالی خولی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ اگر روس کو صلح کرنی ہے تو وہ اس کا عملی ثبوت کوریا جرمنی وغیرہ میں دے۔ اس متضاد روش پر امریکہ اور انگلستان کے اختلافات ابھرتے نظر آئے۔ روسی قائدین نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ بظاہر کامیاب نہیں ہوئی اور انگلستان اور امریکہ کے اختلافات زیادہ نہ بڑھ سکے۔ ان اختلافات کو کم کرنے کیلئے امریکہ نے یہ تجویز پیش کی کہ جزیرہ برمودہ میں امریکہ، انگلستان اور فرانس کے اعلیٰ قائدین کے مابین گفتگو ہو۔ یہ کانفرنس جسے جون کے وسط میں منعقد ہو جانا چاہئے تھا آج تک منعقد نہیں ہو سکی۔ پہلے تو اس کی وجہ یہ ہوئی کہ فرانس حسب دستور وزارت سے محروم ہو گیا اور نئی وزارت معمول سے زیادہ وقت طلب ہو گئی۔ کئی ہفتوں کے بعد آخر کار جب وزارت کی تشکیل ہوئی تو چرچل کی علالت کی خبر آ گئی۔ بعض حلقے چرچل کی علالت کو سیاسی حیلہ قرار دینے پر مصر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ کو روس سے مذاکرات امن شروع کرنے پر آمادہ نہ کر سکنے کا نتیجہ یہ ہے کہ چرچل نے اپنی عزت کے پاس سے بیماری کا بہانہ بنا لیا۔ بہرحال اس اثنا میں یہ طے پایا کہ ابطالِ ثلاثہ کی ملاقات تک ان کے نائبین کی کانفرنس ہو جائے تاکہ اس کیلئے فضا سازگار ہو جائے۔ یہ کانفرنس گزشتہ مہینے ختم ہو گئی۔ انگلستان اور فرانس امریکہ کے نمائندوں کو اس پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ دول عظمیٰ اربعہ کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس طلب کی جائے۔ ان کوششوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اس کے متعلق پیشین گوئی مشکل ہے۔ کیونکہ

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ایران کی کشمکش

صدیوں کے جمود کے بعد عالم اسلام ایک کروٹ لیتا نظر آتا ہے۔ اس صدیوں کے بند پانی میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو رہا ہے لیکن کیا اس کے سینے سے بقول اقبالؒ "وہ موج تند جولاں" ابھرے گی کہ

نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا؟

دیدہ خواہد شد! عالم اسلامی کے حالات و کوائف کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فطرت اس بحر مردہ کی گہرائیوں میں گوہر حیات کی تلاش میں ہے۔ وہ گوہر کب میسر آئیگا۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!

ایران، برطانیہ اور روس کے دو پاٹوں میں پس رہا ہے۔ اس میں حرکت کے آثار کوئی دو سال پیشتر پیدا ہوئے جبکہ اسے اپنی بے حساب دولت ــــ تیل ــــ کو انگریز کے پنجۂ اقتدار سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لینے کا خیال آیا۔ سیاسی اور معاشی اعتبار سے یہ مطالبہ ازبس ضروری ہے۔ ایران اسوقت تک صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ان ذخائر و ذرائع دولت کو اپنے قبضہ میں نہ کر لے۔ لیکن معاشی و سائنسی پسماندگی کے طفیل وہ اس قابل نہیں کہ انگریز سے تیل کا پورا پورا اقتدار چھین لے اور اس کاروبار کو بطریق احسن چلالے۔ چنانچہ یہ سلسلہ قریباً معطل پڑا ہے اور چونکہ ایران کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تیل ہی تھا اس لئے ایران معاشی بدحالی کا شکار ہو چکا ہے۔ اس بدحالی نے اشتراکی جماعتوں کو خاصی تقویت دیدی ہے۔ اسوقت صورت حال یہ ہے کہ ملک میں ایک ہی منظم سیاسی جماعت ہے اور وہ ہے تودہ پارٹی۔ وہ کمیونسٹ جماعت ہے اور ہر چند خلاف قانون قرار دی جا چکی ہے لیکن کئی ناموں سے مصروف عمل ہے۔ یہ ایک نہایت خطرناک علامت ہے۔ اگر تیل کے تنازع کے حل کی کوئی صورت نہ نکل سکی تو خدشہ ہے کہ کمیونسٹوں کا زور اتنا بڑھ جائے کہ وہ ملک پر قابض ہو جائیں۔ اس نزاع سے ملک جن مصائب میں مبتلا ہوا ہے ان میں مزید اضافہ اندرونی کشیدگیوں نے کر دیا ہے۔ ڈاکٹر مصدق وزیر اعظم ایران اور شاہ ایران میں اختلافات کی جو آگ دبی ہوئی تھی وہ بھڑک اٹھی ہے۔ اب مصدق کی یہ کوشش ہے کہ وہ شاہ کو بے دست و پا کر دے۔ مصدق نے شاہ کے اہل خانہ پر واضح طور پر الزام عائد کیا کہ وہ اس کے زوال کیلئے کوشاں ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ کئی افراد خانہ شاہی قریباً ملک بدر کر دیئے گئے ہیں۔ ایک موقع پر تو خود شاہ ملک سے باہر جانے کیلئے تیار ہو گیا لیکن طہران میں ایسے مظاہرے اور ہنگامے ہوئے کہ اسے رک جانا پڑا۔ اب بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ شاید ملک چھوڑ دے۔ مصدق نے آہستہ آہستہ ہنگامی اختیارات حاصل کر لئے جو پہلے چھ ماہ کیلئے تھے اور بعد میں مزید چھ ماہ کے لئے بڑھا دیئے گئے۔ ان کی رو سے اس نے فوج کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے کہ اس کے کہنے کے مطابق فوج میں اس کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکائی جا رہی تھی۔ نیز اس نے ایک کمیٹی بھی مقرر کر دی جو شاہ کے اختیارات کو آئینی حدود میں لے آئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کئی مہینوں سے تیار ہے مگر مجلس میں زیر بحث نہیں لائی جا سکی۔ پہلے تو آٹھ مخالف ارکان مجلس طہران سے باہر چلے گئے اور انھوں نے مجلس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ اس سے مجلس کے اجلاس منعقد ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد جب بڑی جدوجہد سے ان کو مجلس میں واپس لایا گیا تو مجلس میں ایسی دھینگا مشتی ہوئی کہ اجلاس بے نتیجہ ہو جاتے رہے تا آنکہ تنگ آ کر ڈاکٹر مصدق نے یہ دھمکی دی کہ اگر شاہ سے متعلق رپورٹ منظور نہ ہوئی تو وہ

مجلس کو توڑ دے گا اور استصواب سے فیصلہ کرے گا۔ چنانچہ اس کے کوئی ۳۲ حامی ارکان نے مجلس کی رکنیت سے استعفا دیدیا ہے۔

ڈاکٹر مصدق کا دوسرا حریف کاشانی ہے۔ کاشانی مذہبی راہنما ہے لیکن سیاست میں اس کا انداز کبھی ایک نہیں رہا۔ وہ اور مصدق کئی بار آپس میں ٹکرائے پھر دوستی کے ثبوت دیئے۔ بالآخر یہ ڈھونگ ختم ہی کرنا پڑا۔ اس میں بھی مصدق کی جیت ہوئی ہے۔ وہ کاشانی کو مجلس کے سپیکر کے عہدہ سے ہٹانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ کاشانی نے نہایت غیض و غضب میں کہا کہ ایسے لوگ تختہ دار کے مستحق ہیں۔ یہ مسلمانوں میں مذہب اور غصہ لازم و ملزوم سے ہو چکے ہیں۔

یہ باہمی اختلاف موجودہ معاشی بدحالی کے پس منظر میں نہایت رنجدہ ہیں، لیکن ان سے مفر نہیں۔ یہ بالائے سطح لرزشیں ہیں جن کی تہ میں گہری موجیں دست و گریباں ہیں۔ یہ مظہر ہیں اس اندرونی اضطراب کا جس سے ایران دوچار ہے۔ ایران نہایت اذیت و کرب کے عالم میں ہے لیکن اگر اس کے جسدِ سیاست سے فاسد مادہ نکل گیا اور اس کی روح کو بالیدگی کا موقع مل گیا تو ایک انگلستان کیا کئی استبدادی قوتیں مل کر بھی اس کا بال بیکا نہیں کرسکیں گی اور یہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں چلتا جائے گا۔

مصر کا اضطراب

ایران کی طرح مصر بھی گوناگوں مشکلات کے خلاف نبرد آزما ہے۔ اس کے سامنے ایک مسئلہ انگریز کو سوڈان اور نہر سویز سے بے دخل کرنے کا اور دوسرا اندرونی صفائی اور استحکام کا ہے۔ گزشتہ سال وادیٔ نیل جس فوجی انقلاب سے دوچار ہوئی وہ اس دوگونہ عزم کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔ جنرل نجیب بڑی مستعدی سے ان گھناؤنے نقوش کو مٹانے میں مصروف ہے جن سے ملوکیت نے مصر کو داغدار کیا۔ اس انقلاب کو برپا ہوئے ایک سال ہو چکا ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تحریک اپنے مقاصد میں کامیاب ہو چکی ہے۔ جہاں تک ملوکیت کے خاتمے کا تعلق ہے وہ مقصد پورا ہو چکا۔ اب ملوکیت بالکل مٹائی جا چکی ہے اور مصر ایک جمہوریت بن گیا ہے جس کا صدر نجیب خود ہے۔ ملوکیت کا خاتمہ ایک خوش آئند اقدام ہے لیکن اس کی حیثیت بہرحال تخریبی ہے۔ اس کی افادیت کے بطریقِ احسن بروئے کار آنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ملوکیت کے بجائے جو نظام قائم ہو وہ ملک کے اور ملت کے حق میں مفید ہو۔ یہ نظام تو کس حد تک مفید ہوگا؟ اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مرحلہ بآسانی طے نہیں ہوگا کیونکہ جو سیاسی و زرعی اصلاحات پہلے پہلے ہی نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تھی وہ کماحقہ کامیاب نہیں ہوسکیں۔ اس کے باوصف نجیب اور اس کے رفقاء کے عزائم سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بے شمار اندرونی و بیرونی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرینگے۔ کسی قوم کی کامیابی کا دارومدار اسی مجاہدانہ عزم پر ہی ہوتا ہے۔ اے کاش! اس وقت نجیب کو کوئی ایسا شخص مل جاتا جو اسے قرآنی نظامِ ربوبیت سے آشنا کر دیتا!!

بازیچۂ لشتین نگر

دنیا بھر کا سفر کرکے اب اس خطۂ ارض کی طرف آیئے جو مخالفتوں کے علی الرغم اس دعوے کی بنا پر معرضِ وجود میں آیا تھا کہ اسے اسلامی نظام کی تجربہ گاہ بنایا جائے گا۔ وہ چھ سال سے قائم ہے اور چھ سال سے ہی آئینِ اسلامی کی تدوین کے بلند بانگ منصوبے باندھے جارہے ہیں لیکن "خدا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے"۔ کسی منزل کی جانب چلنا تو درکنار ابھی تک یہی طے نہیں ہوسکا کہ منزل کونسی ہے اور کس سمت کو ہے۔ مجلس دستور ساز نے اساسی حقوق اور بنیادی اصولوں کی تعیین کے لئے

جو ماتحت کمیٹیاں قائم کی تھیں، ان کی سفارشات برسوں کی کاوش، دعرق ریزی کے بعد ۱۹۵۲ء کے آواخر میں تیار ہو کر منظر عام پر آئیں۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کے ایما پر اساسی حقوق والی رپورٹ تو فی الفور منظور کر لی گئی لیکن بنیادی اصولوں سے متعلق رپورٹ کو معرض التوا میں ڈال دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی قوم سے کہا گیا کہ وہ بنیادی اصولوں سے متعلق تبادل تجاویز پیش کرے۔ کئی افراد اور جماعتوں نے اس کے جواب میں اپنی تجاویز مجلس کو بھیجیں۔ بالآخر ان کی روشنی میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اپنی رپورٹ تیار کی اور ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو مجلس دستور ساز میں پیش کی۔ اس رپورٹ کی پیشانی پر ۸۶ ۷ کی طرح یہ لکھا تھا کہ پاکستان میں تمام قوانین کتاب سنت کے مطابق بنائے جائیں گے۔ اس کی سفارشات کے دو پہلو تھے۔ ایک سیاسی اور دوسرا مذہبی۔ سیاسی طور پر رپورٹ نے پاکستان کے مغربی اور مشرقی حصوں کو مساوی نیابت دی اور اس نیابت کو ملک کے دونوں ایوانوں میں قائم رکھا اور مذہبی حیثیت سے اس نے ایک علما بورڈ قائم کیا جو یہ رائے دیتا کہ کوئی قانون کتاب وسنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ ملک میں اس کا جو فوری ردعمل ہوا وہ صرف اس قدر تھا کہ سیاسی اعتبار سے یہ سفارشات ملک کی فلاح کے خلاف ہیں۔ مذہبی پہلو کو بہت کم لوگوں نے درخور اعتنا سمجھا۔ رپورٹ پیش ہوتے ہی دستور یہ کا اجلاس یکم جنوری ۱۹۵۳ء تک ملتوی کر دیا گیا تاکہ ملک کے افراد اس رپورٹ پر غور وخوض کر کے کسی فیصلے پر پہنچ سکیں۔ اسوقت سابق وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کی کوشش یہ تھی کہ دستوریہ کا اجلاس کم سے کم وقت کے لئے ملتوی ہو تاکہ مذکورہ رپورٹ جلد سے جلد منظور ہو جائے۔ کیونکہ آئین کی تدوین پر ضرورت سے زیادہ وقت پہلے ہی ضائع ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس قوم کے وہ طبقات خصوصیت سے مولوی صاحبان جو شدت سے تقاضا کیا کرتے تھے کہ دستور ۱۹۵۲ء کے اختتام سے پیشتر مدون ہونا چاہئے، انھوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مطالعے کیلئے مہلت بہت کم دی گئی ہے۔ دونوں گروہ اپنی اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے کہ یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو دستور کا اجلاس منعقد ہوا لیکن اسے ملتوی کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رپورٹ نے ملک بھر میں ہنگامہ پیدا کر دیا تھا اور تمام طبقے اس کی مخالفت پر اتر آئے تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے مخالفت کا طوفان دیکھکر اجلاس ملتوی کر دیا۔ گو انھوں نے اس سے پہلے اپنے مخالفین کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ رپورٹ پر مناسب غور کرنے کیلئے دستور کا یہ اجلاس زیادہ دیر کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ یہ سیاسی چال تھی۔ چنانچہ خواجہ صاحب اجلاس ملتوی کر کے لاہور پہنچے اور پنجاب کے قائدین کو رپورٹ منظور کر لینے پر رضامند کرنے لگے۔ پنجاب مساویانہ نیابت کو بالکل قبول نہ کر سکا اور خواجہ صاحب وہاں سے ناکام لوٹے۔ البتہ وہ اتنا کر آئے کہ پنجاب کے قائدین مشرقی پاکستان کے قائدین سے ملنے جائیں اور باہمی طور پر کوئی تصفیہ کر لیں۔ یہ ملاقات آج تک نہیں ہو سکی۔ اس ہنگامہ میں دستوریہ کا اجلاس ۱۲ جنوری ۱۹۵۳ء کو پھر منعقد ہوا۔ اس تاریخ کو رپورٹ منظوری کے لئے پیش کرنا تھی۔ لیکن جب اجلاس منعقد ہوا تو آپ نے اپنے نام کی قرارداد پیش ہی نہیں کی اور چونکہ اجلاس صرف انہی کی قرارداد کے لئے انعقاد پذیر ہوا تھا اس لئے اجلاس بلا تعین تاریخ ملتوی ہو گیا۔ اس کے بعد ابھی تک دستور ساز کا کوئی اجلاس منعقد ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ بنیادی اصولوں کی رپورٹ اس طرح گلدستہ طاق نسیاں بن گئی۔ اس وقت گویا مجلس دستور ساز کی ساری کارگذاری بجز ایں نیست کہ ایک قرارداد مقاصد اور اساسی حقوق کی رپورٹ پاس کی اور بس۔

نئی حکومت کے عزائم

البتہ نئی حکومت نے جو نئے عزائم لیکر قائم ہوئی ہے آئین کی تسوید کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور ملک کو ابھی تک یقین پر یقین دلائے چلی جا رہی ہے کہ کم سے کم وقت میں آئین مرتب کر دیا جائیگا۔

اس ضمن میں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ نئے وزیر قانون جن کی نگرانی میں دستور تیار ہوگا، جناب بروہی صاحب ہیں، جنھوں نے گذشتہ سال یہ ہنگامہ خیز "تحقیق" اخبارات میں شائع کرائی تھی کہ قرآن کی دفتین میں ایسے اصول نہیں مل سکتے جو کسی ملک کے آئین کی اساس بن سکیں۔ چنانچہ انھیں اپنی اس "تحقیق" پر اس قدر بھروسہ تھا کہ انھوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر ان کا فریق مخاطب یہ ثابت کر دے کہ قرآن میں ایسے اصول ملتے ہیں جن کے مطابق اسلامی حکومت کا خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے، اسے پانچ ہزار روپے کا نقد انعام دیا جائیگا اب یہ وزیر صاحب ہمارے لئے "اسلامی" آئین بنا رہے ہیں۔ نیز ہمارے وزیر اعظم پچھلے دنوں، اخباری اطلاع کے مطابق لندن میں صاف کہہ آئے ہیں کہ پاکستان کا دستور سیکولر ہوگا اور مذہبی نہیں ہوگا۔ آپ نے اپنے وطن میں پہنچ کر اس کی تردید کر دی، لیکن یہ تضاد بالکل قابل فہم ہے۔ ان حالات میں جو آئین مرتب ہوگا وہ کس حد تک قرآنی ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور پھر ابھی دستور تیار ہی کہاں ہوگا۔ ابھی تو خیر سے محض ایک عارضی خاکہ تیار ہوگا جس میں ان امور کو لیا جائے گا جن پر ملک میں عمومی اتفاق پایا جاتا ہے۔ یہ عارضی آئین کی بھی تاریخ آئین میں بالکل عجوبہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو عارضی قانون وہ ہے جو ہمارے مستقل آئین کی بجائے ان دنوں نافذ ہے، اور یہ ہے ۱۹۳۵ء کا قانون ہند جس میں وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق ترمیمات کر لی جاتی ہیں۔ جہانتک اسلامی نظام کا تعلق ہے وہ یا تو سارے کا سارا نافذ ہوگا یا سارے کا سارا ساقط العمل رہے گا۔ نیز وہ عارضی نہیں ہوگا مستقل ہوگا۔ انہی عزائم سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے قائدین کا دستور اسلامی سے متعلق کیا عندیہ ہے۔

یہ رہے ارباب حکومت۔ دوسری طرف ہمارے ارباب شریعت ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ وہ مذہب کے نقاب میں، ملک میں خلفشار پیدا کرنے کیلئے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے ہیں اور بیچارے سادہ لوح مسلمان کو "جنت کے وعدے" دلا دلا کر تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ کیسی بڑی ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ ہزار برس میں یہ نہیں متعین کر سکے کہ "اسلام کیا ہے" (اسلئے کہ ان میں سے ہر فرقہ کا اسلام الگ ہے اور ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور باقی تمام فرقوں کو جہنمی قرار دیتا ہے) وہ لوگ یہ دعوے لیکر اٹھے ہیں کہ ہم اسلامی آئین مرتب کرینگے۔ کتنا بڑا فریب ہے جو اپنی مطلب براری کیلئے قوم کو دیا جا رہا ہے۔

سیاسی فضا

اگر چھ سال تک آئین کا مرتب نہ ہو سکنا بالکل ناقابل معافی ہے اور اس کا بیّن ثبوت کہ ہماری موجودہ قیادت اس فریضہ اولیں کی بجا آوری میں کلیتہً ناکام رہی ہے، لیکن پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ راہ کی غیر معمولی دشواریوں سے اتنے وقت میں بھی اتنا عظیم الشان کام سرانجام دے لینا ممکن نہ ہو۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دوران میں انھوں نے ملک کی سیاست کو کن خطوط پر تشکیل کیا ہے۔ اس پہلو سے ملک کا جائزہ لیا جائے تو آئین سے متعلق مایوسی اور زیادہ نمایاں اور مکمل ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں جمہوریت اور بالخصوص اسلامی جمہوریت کا بڑا شہرہ ہے لیکن عملاً جس طرح جمہوریت کا منہ چڑایا گیا ہے اس سے اس ملک میں جمہوریت کا پنپنا مشکل نظر آتا ہے۔ اس دوران میں صوبہ سرحد، صوبہ پنجاب، صوبہ سندھ اور ریاست بہاولپور

میں نئے انتخابات ہو چکے ہیں۔ ان تمام انتخابات میں مسلم لیگ جیسی مردہ جماعت کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ سرکاری اقتدار سے کام لیکر مسلم لیگی نامزدگان کو منتخب کرایا گیا اور حریفوں کو ناکام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ دیگر جمہوری ممالک میں نئے انتخابات ملک کے سیاسی رجحانات کا آئینہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کا مطالبہ بھی کیا جاتا ہے اور ان کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلتا ہے لیکن یہاں انتخاب سے پہلے ہی انتخاب کا نتیجہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان انتخابات کے باوجود اس وقت سرحد، پنجاب اور سندھ کے وزرائے اعلیٰ اور مرکز کے وزیر اعظم وہ اشخاص ہیں جو باقاعدہ طور پر منتخب ہو کر نہیں آئے۔ یہ حضرات جب چاہیں گے اور جہاں سے چاہیں گے منتخب ہو جائیں گے۔ [چنانچہ پنجاب کے وزیر اعظم تو منتخب ہو بھی چکے ہیں] یہ انتخابات درحقیقت اس قسم کے ہیں جیسے ہمارے اموی اور عباسی بادشاہ پہلے تخت پر بیٹھ جاتے تھے اور بعد میں اپنی بیعتِ خلافت لیتے تھے اور اس طرح یہ ثابت کر دیتے تھے کہ ہم لوگوں کی مرضی سے بادشاہ بنے ہیں۔ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کی یہ کیفیت ہے کہ سال میں بمشکل ایک آدھ مرتبہ ان کے برائے نام اجلاس ہوتے ہیں جن میں مباحثوں کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ حکومت جو اقدامات کرتی ہے ان پر بلا تکلف صاد کرا لیا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ ان اسمبلیوں کا نہ کوئی فریضہ ہے نہ فائدہ۔

تعلیمی پس ماندگی اگر بالفرض یہ بھی مان لیا جائے کہ عملی طور پر بحالاتِ موجودہ، اس سے بہتر نظام نہیں بنایا جا سکتا تھا تو پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر صحیح اسلامی تصور کے عام کرنے کیلئے کیا اقدامات کئے گئے۔ اس کا بہترین طریقہ صحیح تعلیم ہے لیکن ہماری قومی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ اس قدر محروم التفات ہو جس قدر تعلیم ہے۔ اسلامی نصب العین کا شعور پیدا کرنے کے لئے جس قسم کے نصاب کی ضرورت ہو سکتی ہے، اس کا تو ذکر ہی کیا، عام تعلیم جو سکولوں میں دی جایا کرتی تھی، اس کے انتظامات بھی دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ محض یہی نہیں کہ تعلیم کا معیار کمتر ہے بلکہ بچوں کو سکولوں میں جگہ نہیں ملتی اور وہ داخل تک نہیں ہو سکتے۔ جو داخل ہوتے ہیں انھیں کتابیں نہیں ملتیں۔ خود کراچی کے متعلق سرکاری اندازہ یہ ہے کہ کم از کم ۳۶۳ نئے سکول اور چاہئیں۔ اس کے مقابلے میں صرف بائیس نئے سکولوں کا انتظام کیا گیا ہے جن میں سے بمشکل آٹھ تیار ہو سکے ہیں۔ پنجاب کے وزیر تعلیم نے جولائی کے مہینے میں یہ انکشاف کیا کہ صوبے بھر میں تئیس لاکھ بچے قابلِ تعلیم ہیں جن میں سے صرف چھ لاکھ ستر ہزار کی تعلیم کا انتظام ہے۔ باقی بچے کسی سکول میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان تعلیمی لحاظ سے کس اسفل درجے میں ہے۔ گو کہنے کو پاکستان میں خواندگی کا تناسب ۱۳ فی صدی ہے لیکن ان میں سب ایسے "خواندہ" لوگ شمار کر لئے گئے جو محض اپنا نام لکھ سکتے ہیں، اور بالکل خواندہ نہیں ہیں۔ اس کمل ناخواندگی کو دور کرنے کیلئے حکومت پاکستان نے ایک شش سالہ منصوبہ تیار کیا تھا لیکن نہ جانے وہ کونسی غار میں بند پڑا ہے۔

غذائی و معاشی بحران یہ کچھ بھی اپنے ہاں نہیں ہو سکا تھا تو یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ معاشی اعتبار سے ہی ملک کا معاملہ بطریقِ احسن چلایا گیا ہوگا لیکن یہاں بھی نہایت المناک صورت حال سامنے آتی ہے۔ تقسیم سے فوراً بعد پاکستان غذائی بحران سے دوچار ہو گیا تھا کیونکہ یک لخت جو افراتفری پڑی اور مہاجرین کے ریلے آئے ان میں نظم غذا و معاش کو برقرار رکھنا آسان نہ تھا

ع۱ ان آٹھ کے متعلق بھی معلوم ہوا کہ عمارات بن چکنے کے بعد پتہ چلا کہ ان کے دروازے ہی نہیں ہیں چنانچہ اب دروازوں کے لئے ولایت آرڈر بھیجا گیا ہے۔ [دیکھ لیجئے! سکولوں کی کمی کو کس طرح پورا کیا جا رہا ہے؟]

لیکن دوسرے سال ہی حالات سدھر گئے اور غذائی صورت حال کے ساتھ ساتھ معاشی حالت بھی بہتر ہونے لگی۔ ۱۹۵۰ء میں کوریا کی جنگ شروع ہوئی تو اس سے ہماری اقتصادی پوزیشن اور مستحکم ہو گئی کیونکہ ہمارے ملک کی خام پیداواریں، جوٹ اور کپاس وغیرہ غیر معمولی قیمتوں پر دوسرے ممالک نے خرید لیں۔ اس نے حکومت سے بھی خوب ہاتھ رنگے۔ مثلاً صرف ایک کپاس کے معاملے میں حکومت نے برآمدی محصول اتنا بڑھا دیا کہ کوئی بیس کروڑ روپے کی آمدنی ہو گئی۔ یہ آمدنی باد آورد تھی اور برباد ہو گئی۔ سابقہ حکومت کی درآمدی پالیسی اس نوعیت کی رہی کہ یہ ساری آمدنی سامان تعیش خرید کرنے میں صرف ہو گئی اور صنعتی ترقی کیلئے کوئی قابل ذکر انتظامات نہیں کئے گئے۔ بالآخر حالات نے پلٹا کھایا۔ کوریا میں امن کی گفتگوئیں شروع ہو گئیں جس سے ہماری خام پیداوار کی مانگ کم ہو گئی۔ کچھ تو کپاس کی غیر معمولی قیمتوں سے لوگوں نے دوسرے سال کپاس کی کاشت زیادہ کی اور غذائی اجناس کی کاشت کم ہوئی، کچھ قدرت کی ستم ظریفی سے بارش کم ہوئی اور کچھ اپنی نااہلی سے کھیتوں کو سیراب کرنے کیلئے کنوؤں کے جو منصوبے بنائے جاتے رہے وہ شرمندۂ عمل نہ ہو سکے۔ چنانچہ غذائی فصل بہت کم ہوئی۔ یہانتک کہ غیر ممالک کو غذا مہیا کرنے والا پاکستان غذا کے لئے محتاج ہو گیا۔ یہ کچھ ہو رہا تھا اور ارباب اقتدار میٹھی نیند سو رہے تھے۔ وہ ملک کو ہر بار یہی یقین دلاتے تھے کہ غذائی صورت حالات اتنی مخدوش نہیں ہے جتنی کہ بیان کی جاتی ہے، نیز یہ حالت بھی بالکل عارضی ہے۔ اِدھر ملک کو یہ تسلیاں دی جا رہی تھیں اُدھر خواجہ ناظم الدین صاحب نے ایک دن امریکہ کی طرف یہ اپیل بھیجی کہ پاکستان کو پندرہ لاکھ ٹن گیہوں کی فوری ضرورت ہے جس میں سے امریکہ کم از کم ایک لاکھ ٹن غلہ مہیا کرے۔ اس کے ساتھ یہ اعلان بھی تھا کہ پاکستان اتنی بڑی مقدار خریدنے کے قابل نہیں۔ گویا پاکستان نہ محض غذائی بحران ہی سے دوچار تھا بلکہ اقتصادی اور مالی بحران کی زد میں بھی آ گیا تھا۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ ہماری خوش بختی ہے کہ امریکہ نے ...... گیہوں بطور "تحفہ" دیکر پاکستان کو اس عظیم الشان بحران سے بچا لیا۔ ورنہ اگر پاکستان کو اس کی نقد ادائیگی کرنا پڑتی تو شاید سنبھلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہم نے "نقد ادائیگی" اسلئے کہا ہے کہ اس کی قیمت تو ہم سے بہر حال وصول کی جائے گی۔ لیکن کیا معلوم وہ کس کس شکل میں وصول کی جائے۔ یہ "سوداگر" بھی "کسی کو کچھ مفت" تھوڑا دیتے ہیں؟

ملک ایسے سیلاب ہلاکت میں گھر جائے تو عام مایوسی کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ اس مایوسی میں بددلی کا یوں اضافہ ہوا کہ ملک تباہی کے غار میں دھکیلا جا رہا تھا لیکن بے بس تھا۔ وہ ان قائدین سے گلوخلاصی نہیں کرا سکتا تھا۔ جو اس کے یقینی طور پر ذمہ دار تھے۔ انتخاب کے ہنگاموں نے ملک کے حوصلے اور پست کر دیئے کیونکہ حکومت بدلنے کا یہ جمہوری حربہ بیکار محض ہو گیا تھا۔ یہ حالات تھے کہ گورنر جنرل غلام محمد صاحب نے اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کر دیا۔ اس غیر معمولی اور جرأت مندانہ اقدام نے قوم کی ڈھارس باندھ دی اور انہیں یہ اطمینان ہو گیا کہ جو نتیجہ نام نہاد جمہوری طریقوں سے ممکن نہیں ہو سکتا تھا وہ گورنر جنرل نے بیک جنبش قلم پیدا کر کے دکھا دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اطمینان کی رو کب تک قائم رہے گی؟ محمد علی صاحب کی نئی حکومت نے سوائے سطحی امور کے ابھی تک کوئی کارنمایاں سرانجام نہیں دیا۔ اور تو اور وہ تادم تحریر اپنی وزارت تک مکمل نہیں کر سکے ہیں۔ نہ ابھی تک انھوں نے تجارتی پالیسی کا اعلان ہی کیا ہے۔ ان دنوں قیمتوں کے کنٹرول کا جو چرچا ہو رہا ہے، اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ بازار سے اشیائے ضروری معدوم ہو گئی ہیں اور عوام

مارے مارے پھر رہے ہیں۔ واجبی قیمتوں کی دوکانیں کھولنے کے منصوبے ہو رہے ہیں۔ لیکن اب تک یہ تجربہ ہمارے جیسے ملک میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے علاوہ بے روزگاری بڑھتی جا رہی ہے۔ غذائی پیداوار بڑھانے کی طرف کوئی حقیقی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ صنعتی ترقی کی رفتار تیز نہیں ہو سکی۔ زراعت پرانی رقیانوسی راہوں پر چلی جا رہی ہے۔ کسان پس رہا ہے اور پیداوار کم ہوتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں ایسے مردان ہنگامہ کی ضرورت ہے جو ملت کی خوابیدہ قوتیں بیدار کریں اور انھیں تعمیری کاموں پر لگا دیں۔ لیکن اس کے لئے جس بیدار مغزی، گرمیٔ قلب اور ولولۂ عمل کی ضرورت ہے اس کا سراغ ڈھونڈھے سے نہیں ملتا۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو پاکستان ایک دوراہے پر کھڑا ہے "مسکین دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر" کہ

جاؤں کدھر کو میں

پاکستان ایک گہرے اضطراب سے دوچار ہے۔ اس کی روح بے پناہ اذیت و کرب میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ربانی تعبیر) فطرت پاکستان کی روح کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے بسنے کیلئے ایک نئی دنیا تلاش کر رہی ہے۔ یہ آدم فطرت کے ہاتھ کب لگے گا؟ اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اقبال کی روح اور طلوع اسلام کی دعوت قرآنی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ تلاش ناکام نہیں ہو سکتی۔ یہ قرآنی دعوت ہماری ہزار سالہ تاریخ میں سب سے پہلی کوشش ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے بھی بعض افراد نے اپنے اپنے طور پر اس انداز سے سوچا ہو لیکن ہم تک نہ تو ان کی قرآنی فکر پہنچی ہے اور نہ ہی اس کے نتائج کو تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ رکھا ہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ جس قرآنی فکر اور نظام کی دعوت طلوع اسلام کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے اس کی مثال ہمارے زمانے میں ساری دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اگر یہ قرآنی تحریک کامیاب ہو گئی تو اس سے نہ صرف پاکستان کی تقدیر ہی جگمگا اٹھے گی بلکہ ساری دنیا ایک خوشگوار انقلاب سے مطلع انوار بن جائے گی۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است!

اعلان

بعض حضرات اپنے مراسلات میں اپنا نام اور پتہ تحریر نہیں فرماتے جس سے غالباً ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کو طلوع اسلام کے ذریعے جواب دیا جائے حالانکہ وہ امور اتنے اہم نہیں ہوتے کہ رسالہ میں ان کا جواب دیا جا سکے۔ لہٰذا ایسے تمام حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اپنے خطوط میں اپنا مکمل پتہ تحریر فرما دیا کریں ورنہ ادارہ کو جواب سے معذور تصور فرمائیں۔ اگر وہ رسالہ میں اپنا نام شائع نہ کرنا چاہیں تو اس کی تصریح کر دیا کریں۔ اس کی تعمیل کی جائیگی۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

اگر یک قطرۂ خون داری .....

(محترم خورشید عالم صاحب)

نظام ربوبیت کیسے قائم ہوگا؟ یہ وہ سوال ہے جو ان دنوں اکثر پوچھا جا رہا ہے۔ قارئین طلوع اسلام کے خطوط بھی اسی بے تابی تمنا کے مظہر ہوتے ہیں اور پرویز صاحب کے ہاں اتوار کی مجلس درس میں بھی اسی قلبی اضطراب کا بے ساختہ مظاہرہ ہوتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں مجلسِ درس میں یہ سوال پوچھا گیا تو اس کا جواب پرویز صاحب نے یہ دیا کہ ابھی ہمیں "تبلیغ" کرنا ہوگی تاکہ یہ فکر عام ہو جائے اور تبلیغ کا مفہوم انھوں نے اپنے خصوصی انداز میں یہ بتایا کہ عرب بالعموم ایک رسی اپنے پاس رکھا کرتے تھے جسے "تبلغة" کہا جاتا تھا۔ اس رسی کا فائدہ یہ تھا کہ جن صحرائی کنوؤں کے پانی کی سطح نیچے ہو جایا کرتی تھی ان سے پانی بھرنا مشکل ہو جایا کرتا تھا کیونکہ جو رسی اس مقصد کیلئے کنوئیں پر رکھی رہتی تھی وہ چھوٹی ہو جایا کرتی تھی۔ چنانچہ عرب اس "تبلغہ" کو ساتھ باندھ کر پانی بھر لیا کرتے تھے۔ گویا تبلیغ کا مفہوم یہ ہے کہ راستے سے بھٹکے ہوئے ہر شخص کی اتنی مدد کر دی جائے کہ وہ صحیح راستے تک پہنچ جائے۔ "پیاسے" کی پانی تک پہنچنے میں جسقدر کمی ہو اس کمی کو پورا کر دیا جائے۔

پرویز صاحب ایک مفکر اور عالم ہیں، وہ اس سوال کا جواب فکری اور علمی انداز سے دیتے ہیں لیکن میرے جیسا عامی آدمی جو علم سے محروم ہے لیکن قلب زندہ اور ولولۂ عمل رکھتا ہے اسے اپنے نقطۂ نگاہ سے یوں دیکھتا ہے۔ میرے نزدیک تبلیغ کی صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ طلوع اسلام کا لٹریچر زیادہ سے زیادہ شائع و رائج ہو تاکہ عام لوگ زیادہ سے زیادہ اس سے روشناس ہوں اور ان کے فکر و نظر کے زاویے بدلنے لگیں۔ یہ کام اب تک نہایت محدود پیمانے پر ہوا ہے لیکن اب جبکہ طلوع اسلام نے اس کے لئے لائحۂ عمل تیار کیا تو اس کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بلکہ ایک ہی رکاوٹ، سرمایہ کی کمی نظر آئی۔ عام طور پر سرمایہ کی کمی چندے کی اپیلوں سے پوری کی جاتی ہے۔ طلوع اسلام نے اپنے خون جگر کی سرخی پر بھروسہ رکھتے ہوئے نہ اب تک کسی سے چندہ مانگا، نہ مانگ ہی سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ معاونین طلوع اسلام کا حلقہ یوں قائم ہو جائے کہ احباب ایک سو روپیہ یکمشت دیدیں یا یہ رقم چار قسطوں میں ادا کر دیں اور اس کے معاوضے میں انھیں طلوع اسلام اور اس کا لٹریچر دیا جائے۔ تاکہ اتنا سرمایہ جمع ہو جائے جس سے اشاعت کے لائحۂ عمل کو بروئے کار لایا جاسکے۔ یہ تجویز ہمارے سامنے کئی مہینوں سے آچکی ہے۔ اس پر جن جن حضرات نے لبیک کہی ان کے اسمائے گرامی سابقہ اشاعت میں آپ کی نظر سے گذر چکے ہیں۔ اس سے ایک نہایت تلخ حقیقت میرے سامنے آئی ہے۔ آپ تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ یہ حقیقت آپ کو اس کے ایک ایک صفحے پر درخشاں حروف میں ملے گی کہ جب بھی کوئی دعوتِ انقلاب بلند ہوئی ہے، اس تحریک کی کامیابی کا دار و مدار ان سابقون الاولون پر رہا ہے جنھوں نے سب سے پہلے اس پر لبیک کہی۔ ایک مرتبہ لبیک کہنے کے بعد انھوں نے اپنا تن، من، دھن اس تحریک کو کامیاب بنانے پر صرف کر دیا۔ لیکن ہماری اس دعوت قرآنی کی تحریک کا یہ حال ہے کہ اس میں سب سے زیادہ غفلت شعار

اور سہل انگار وہ طبقہ ہے جسے اس دعوت سے قریب ترین تعلق حاصل ہے اور جنھوں نے سب سے پہلے اس پر لبیک کہی ہے۔ میں نے طلوعِ اسلام کی جولائی کی اشاعت میں شائع شدہ فہرست کو بار بار پڑھا، ان میں زیادہ تر وہی اصحاب شامل ہوئے ہیں جو دور دراز کے ہیں اور طلوعِ اسلام کو قریب سے دیکھنے کا انھیں کبھی موقع نہیں ملا۔ (یہاں میں تعداد کا ذکر نہیں کر رہا، وہ تو افسوسناک ہی ہے!) وہ لوگ جن کے سامنے پرویز، طلوعِ اسلام اور ادارۂ طلوعِ اسلام ایک کھلی ہوئی کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ اس فہرست میں خال خال دکھائی دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری تحریک کی یہ سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ اس سے ایک بنیادی خامی کا پتہ چلتا ہے جو کسی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار نہیں ہونے دے گی جس تحریک کے سب سے قریبی وابستگان کا یہ حال ہو، بھلا وہ تحریک کبھی پروان چڑھ سکتی ہے؟ یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ قرآنی تحریک اور خاکم بدہن کامیاب نہیں ہوگی! لیکن میری آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے اسے میں کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔

جنازے کی نماز کو اصطلاحاً فرضِ کفایہ کہا جاتا ہے، یعنی اگر سارے شہر میں چار آدمی بھی میت کو اٹھا کر قبرستان تک لے جائیں اور نماز پڑھ لیں تو سب کے سر سے یہ فرض ادا ہو جاتا ہے۔ مجھے معاف کیجئے گا اگر میں یہ کہوں کہ ہم نے بھی، غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیا ہے کہ اس قرآنی تحریک کا "جنازہ" اٹھانے والا پرویز موجود ہے، وہ اسے ٹھکانے لگا کر ہی دم لے گا۔ لہٰذا "اذھب انت وربک فقاتلا" اسے اور اس کے رب کو لڑنے دو۔ نحن ھھنا قاعدون۔ ہم مزے سے بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ لیکن —— والعصر ان الانسان لفی خسر۔ زمانہ شاہد ہے کہ ایسے انسان ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ تیرہ سو سال سے ہم اس آیت جلیلہ کے اس ٹکڑے کی تفسیر بنے ہوئے ہیں، اب آیئے اس آیت کو مکمل کریں —— اور اگلے ٹکڑے —— یعنی الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات تک پہنچیں کہ کھیتیاں انہی کی ہری بھری ہوتی ہیں اور پکتی ہیں جو ایمان و عملِ صالح دونوں کے پیکر ہوتے ہیں۔ میں جذبات کی رو میں دور نکلتا جا رہا ہوں لیکن

جو ئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں!

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ طلوعِ اسلام کی دعوت سے تمسک فرضِ کفایہ نہیں۔ اگر اسے کامیاب بنانا ہے تو ہم میں سے ہر ایک کو اس میں شریک ہونا ہوگا۔ میں یہاں پرویز صاحب سے اختلاف کی جرأت کرتے ہوئے آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ دوسروں پر "تبلیغ" کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈالیے۔ کسی سے کچھ نہ کہیئے۔ اپنا فریضہ ادا کیجئے، یعنی اس سوال کا جواب اپنے دل سے پوچھئے "کیا میں معاون بن چکا ہوں"؟ اس کا جواب نفی میں ملے تو پھر کام ایک ہی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اپنا حصہ ادا کیجئے۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ آپ اپنے آپ سے یہی سوال کیجئے کہ

"کیا میں معاون بن گیا ہوں"؟

میں سمجھتا ہوں کہ ہم تاریخ کے جس مقام پر کھڑے ہیں وہ کئی اعتبارات سے میدانِ بدر سے مشابہ ہے۔ ایک حقیر، بے سروسامان جماعت اور سامنے مخالفین و کفار کا زرہ میں سرتاپا ڈوبا ہوا لشکر جرار و بے پناہ۔ اسی میدان میں رسولؐ نے یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ! تیرا نام لینے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت آج شکست کھا گئی تو کرۂ ارض پر کہیں کوئی ترا نام نہیں لے گا۔ آج یہی صورت ہماری ہے۔ یہ تحریک — خدانخواستہ — ناکام ہو گئی تو اس کی روسیاہی تمام تر ہمارے حصے میں آئے گی اور نہ جانے اس کے بعد تاریخ کو کتنے موڑ مڑنے پڑیں۔

تا جوہرم بجلوہ گہ رنگ و بو رسید!

اگست کے شمارے کی فہرست تو میرے اس عریضہ کے ساتھ ہی شائع ہو جائے گی۔ مجھے اب ستمبر کے شمارے میں شائع ہونے والی فہرست کا انتظار رہے گا۔

معراجِ انسانیت

معارف القرآن ۔ جلد چہارم

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہو گا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرِ حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس روپے۔ محصولڈاک و پیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے۔

نوادرات

مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری

بڑا سائز ضخامت چار سو صفحات قیمت چار روپے محصولڈاک نو آنے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ کراچی

حقائق و عبر

مُلّا کی ہڑتال

عنوان سے آپ متعجب ضرور ہوں گے اور یہ استعجاب ہے بھی بجا کیونکہ ہمارے ہاں ملا کی ہڑتال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یروشلم میں یہودی ملاؤں نے واقعی ہڑتال کر دی ہے۔ ان کی شکایت یہ ہے کہ انھیں گذشتہ تین ماہ سے تنخواہ نہیں ملی۔ اس ہڑتال سے یروشلم کے کوئی سوا لاکھ یہودی ایک عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ان کے جو بچے پیدا ہو رہے ہیں ان کے لئے مذہبی رسوم ادا کرنے والا کوئی "ملا" نہیں ملتا۔ بچوں کی پیدائش تو بہرحال قانون قدرت کے تحت ہو رہی ہے البتہ یہودیوں کی شادیاں اور طلاقیں رک گئی ہیں کیونکہ یہ ملاؤں کے بغیر طے ہی نہیں پا سکتیں۔ مزید برآں انھیں اپنے مردے دفن کرنے میں بڑی دشواری پیش آ رہی ہے کیونکہ یہاں پر بھی مناسب مذہبی رسومات ادا کرنے کیلئے کوئی "ملا" نہیں ملتا۔

آپ یہ سن کر یہودیوں کی بے بسی پر حقارت آمیز ہنسی ہنسئے گا اور کہئے گا کہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت و مسکنت مسلط کر دی تھی۔ لیکن جیسا کہ قرآن نے جگہ بجگہ بنی اسرائیل کی مثالیں دے دے کر مسلمانوں کو عروج و زوال کے اصول سکھائے ہیں اور عبرت دلائی ہے، اسی طرح اتفاق سے آج بھی یہودی ہمارے لئے سبق آموز مثالیں پیش کر رہے ہیں۔ ملا کا جو تسلط یہودی معاشرت پر ہے بعینہ ویسا تسلط ملا کا ہماری معاشرت پر بھی ہے۔ ذرا آپ ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ جب ہمارے گھروں میں بچے پیدا ہوتے ہیں تو شیر مادر جیسی حلال و طیب شے ان پر حرام رہتی ہے جب تک ملا آ کر ان کے کانوں میں اذان نہ کہدے۔ ہماری شادیاں "میاں بیوی" دونوں کے راضی ہونے کے باوجود تکمیل تک نہیں پہنچ سکتیں جب تک ملا نہ آ جائے۔ طلاق کے تمام مسائل بھی ملا ہی کے ذریعہ حل ہوتے ہیں اور اسی سے فتوے لئے جاتے ہیں۔ اور جب مرنے کا وقت آتا ہے تو نہ ملا کے بغیر غسل دیا جا سکتا ہے، نہ جنازہ تیار ہوتا ہے، نہ مردے کو دفن ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے ہاں ملا اتنا "ترقی یافتہ" نہیں ہوا کہ وہ اپنی ٹریڈیونین علیحدہ بنا کر ہڑتال وغیرہ کے حربوں پر اتر آئے (اگرچہ جس رخ پر اسے "ماڈرنزم" لئے جا رہی ہے اس سے یہ بھی کچھ بعید نظر نہیں آتا) لیکن آپ سوچئے کہ اگر ایسا ہو جائے تو آپ کیا کریں گے۔ جب زندگی میں ایک قدم بھی ملا کے بغیر چلنا مشکل ہے تو ملا ہڑتال کر دے تو معاشرت کی ساری گاڑی رک جائے گی۔ عملاً ملا کا تسلط ہمارے قلوب و اذہان پر اس قدر گہرا ہو تو ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم "ملا ازم" کے خلاف ہیں؟ کیا اس تسلط نے ہمارے معاشرے میں یہ جلی ثنویت نہیں پیدا کر رکھی کہ دنیا کے معاملات تو بذریعہ حکومت طے ہوں اور "دینی" معاملات مُلّا کے ہاتھوں؟ اس ثنویت کا یہ عالم ہے کہ مملکت پاکستان کے گورنر جنرل اور وزیر اعظم (جو دونوں ملا ازم کے اس قدر خلاف ہیں) عید کے اجتماع میں بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہتے ہیں تاآنکہ ایک جاہل مُلّا ایک کونے سے اٹھ کر بر سر منبر نہیں آ جاتا اور جو کچھ اس کی زبان پر آئے انھیں سنا کر جانے کی اجازت نہیں دیدیتا۔

اب اس کے بعد اگر ملا یہ کہے کہ جن لوگوں کے نکاح اور طلاق ہماری سند کے بغیر نکاح اور طلاق قرار نہیں پاتے، انھیں نکاح و طلاق کی بابت قوانین مرتب کرنے کا کیا حق ہے اور وہ کس منہ سے اس کا دعویٰ کرتے ہیں، تو اس کی اس دلیل کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ یاد رکھئے جب تک ہمارے معاشرے میں یہ ثنویت رہے گی، ملا سے پیچھا نہیں چھوٹ سکتا، اور جب تک ملا سے پیچھا نہیں چھوٹتا آپ میں زندگی کی رمق نہیں آسکتی۔

۲۔ ناقدرشناس قوم!

۱۷ر جولائی کا واقعہ ہے کہ ماری پور (کراچی) کے فوجی ہوائی اڈے پر حکومت پاکستان کے دو افسر اعلیٰ، چیف کمشنر اور انسپکٹر جنرل آف پولیس، کراچی، گورنر جنرل پاکستان کے استقبال کے لئے کھڑے ہیں جو بلوچستان سے واپس تشریف لا رہے ہیں۔ اتفاق سے ان کے ہوائی جہاز کی آمد میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ جوں جوں وقت زیادہ ہوتا جاتا ہے ان منتظرین کا اضطراب بڑھتا جاتا ہے؛ اس لئے کہ عین اُسی وقت دوسری سمت، ڈرگ روڈ کے ہوائی اڈے پر وزیر اعظم پاکستان ڈھاکہ سے مراجعت فرمائے کراچی ہو رہے ہیں۔ ان کی مشکل یہ ہے کہ اِدھر رہتے ہیں تو وزیر اعظم کا استقبال نہیں ہو سکتا اور اُدھر چلے جاتے ہیں تو گورنر جنرل کا استقبال رہ جاتا ہے۔

غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را

جب گورنر جنرل صاحب کا طیارہ زمیں بوس ہوا ہے تو وزیر اعظم صاحب کے نزول میں صرف دس منٹ باقی تھے۔

ماری پور سے ڈرگ روڈ کا سفر اور دس منٹ کا قلیل ترین وقفہ! کوئی اور ہوتا تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا کہ وہاں بروقت پہنچنا قطعاً ناممکن ہے۔ لیکن انھوں نے، ناامیدیوں کے ان ہجوم میں بھی اپنی ہمت نہیں ہاری —— فوراً رائل پاکستان ایئر فورس کا ایک جہاز طلب کیا اور اس میں بیٹھ کر بارہ میل کی منزل سات منٹ میں طے کر کے وزیر اعظم سے پہلے ڈرگ روڈ آپہنچے!

میرے شیر شاباش! رحمت خدا کی

اور اس پر بھی یہ ناقدرشناس قوم گلہ مند رہتی ہے کہ ہمارے حکام کچھ نہیں کرتے! نمعلوم اس قوم کے ذہن میں بالآخر "کچھ کرنے" کا معیار کیا ہے؟ سات منٹ میں بارہ میل کے فاصلے پر دو استقبال!

اب اور چاہتے کیا ہو، ہمیری مل جائے؟

باسمہ تعالیٰ وبتوفیقہ

نزولِ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی حدیثیں اور ان کی تنقید

صحیح بخاری کی دو حدیثیں

(محترم علامہ تمنا صاحب عمادی)

اخی فی الدین وحبی فی اللہ مولانا عرشی سلمہ اللہ تعالیٰ نے ماہ مئی کے طلوع اسلام میں میری توجہ احادیث نزول مسیح و آمد مہدی کی طرف منعطف کرائی ہے اور خصوصیت کے ساتھ صحیح بخاری کی دونوں حدیثوں پر تنقیدی روشنی ڈالنے کی فرمائش کی ہے۔ خود میرا بھی کبھی کبھی یہ ارادہ ہوا تھا کیونکہ میں ایک مدت سے ان حدیثوں کو موضوع و مکذوب سمجھتا آرہا ہوں۔ مگر خیال ہوا کہ

رمز ہر نکتہ دقیق و ظرف بحث عوام   گر بگو یا رہ کنم کس بہ سخن وانہ رسد

جن حضرات کے نزدیک کتب احادیث آسمانی صحیفے، راویان حدیث حاملان وحی فرشتے اور جامعین احادیث مہبط وحی مثل انبیاء و مرسلین تھے، وہ میری تنقید سے کیا مطمئن ہو سکتے ہیں۔ بلکہ چڑ کر قرآن مجید پر وہ آنے لگیں گے۔ اسلئے ان کیلئے یہ تنقید تحصیل لاحاصل ہے۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اس دعوے پر ایمان رکھتے ہیں کہ مافرطنا فی الکتٰب من شیئٍ ہم نے اس کتاب میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے ونزلنا علیک الکتٰب تبیانا لکل شیئٍ ہم نے یہ کتاب تم پر دین کی ہر بات کھول کر بیان کر دینے کیلئے اتاری ہے۔ وہ اس پر بھی ایمان ضرور رکھتے ہیں کہ نزول مسیح و آمد مہدی اگر کوئی دینی عقیدہ ہوتا تو قرآن مبین میں ان باتوں کی خبر ضرور دی جاتی۔ جب قرآن میں ان کا ذکر نہیں تو ان باتوں کو دینی عقیدہ سمجھنا ہی بدعت و ضلالت ہے۔ اسلئے ان اہل حق کیلئے یہ تنقید تحصیل حاصل ہے۔

عوام کا بڑا طبقہ فرقہ پرستی ہی کو اپنا دین سمجھتا ہے جس کے فرقے کے علماء جو کہہ دیں گے اس کے سوا وہ نہ قرآن کی سننے والا ہے نہ حدیث کی۔ اور نہ وہ حدیث کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے نہ تنقید کے سمجھنے کی۔ اسلئے ان کے سامنے یہ تنقید پیش کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ ان لوگوں کو ہنگامہ آرائی اور فتنہ انگیزی میں وقت اور مال ہی نہیں بلکہ جان تک گنوانا آسان ہے مگر دین کی صحیح خدمت میں جیب سے کچھ پیسے خرچ کرنے والے شاذ و نادر ہی ہیں۔

دیکھئے کہ میرے اور احمدیوں کے درمیان سات ماہ تک ۱۲ دسمبر ۱۹۵۰ء سے ۲۷ جولائی ۱۹۵۱ء تک نہایت معرکۃ الآراء تحریری مناظرہ ہوتا رہا۔ جانبین سے ریجسٹری مراسلے آتے جاتے رہے۔ آخر احمدی مناظر کو ایسی فاحش شکست ہوئی کہ میدان چھوڑ کر ان کو بھاگنا ہی پڑا۔ اس ایک مناظرے میں انھیں تین تین حیثیتوں سے شکست ہوئی۔ مگر کوئی ایسا اللہ کا بندہ کھڑا نہ ہوا جو اس مناظرے کی روداد کو چھپوا دے۔ ایک عزیز دوست نے اس طویل روداد کو مختصر بھی کر دیا۔ تاکم خرچ میں یہ مختصر روداد چھپ کر

مگر پھر بھی کوئی صاحب اس کی اشاعت کیلئے آمادہ نہ ہوئے۔

انھیں وجہوں سے میری ہمت بھی سرد ہوگئی۔ مگر مولانا عرشی کی خاطر بہت عزیز ہے اور پھر یہ بھی خیال ہوا کہ معذرۃً الی ربکم ولعلہم یتقون۔ خصوصاً جب عامۂ مسلمین میں کچھ لوگ ایسے بھی ضرور ہوں گے جو تذبذب میں مبتلا ہوں۔ ان پر اس تنقید سے اتمام حجت ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت دے۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

اسلئے سردست صرف بخاری کی حدیثیں نزول مسیح سے متعلق جو درج ہیں ان کی تنقید پیش کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ اس کے بعد باقی صحاح کی حدیثوں کی تنقید بھی آپ کے سامنے آجائیگی۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ۔

تمنا عمادی مجیبی پاکستانی غفرلہ ——— ڈھاکہ

بخاری کی دو حدیثیں

کتاب بدء الخلق باب نزول عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ملاحظہ فرمایئے۔ اور اس پر ایک نظر رہے کہ کتاب تو آغاز تخلیق سے متعلق مضامین کی ہے مگر اس میں ایک باب ایسا ہے جو خاتمۂ تخلیق دنیا یعنی علامات قیامت سے متعلق کہا جاتا ہے۔ اور "کتاب الفتن" جو ایسی حدیثوں کے ذکر کا اصل مقام ہے خصوصاً "باب ذکر الدجال" کے بعد جہاں دو دو باب ہیں یعنی باب ذکر الدجال کے بعد باب لا یدخل الدجال المدینۃ یعنی مدینہ طیبہ میں دجال داخل نہیں ہو سکے گا۔ یہ بھی موجود ہے۔ مگر نہ دونوں بابوں میں کہیں نزول عیسیٰ بن مریم کا ذکر ہے، نہ اس کا کہیں ذکر ہے کہ دجال کو عیسیٰ بن مریم علیہما السلام قتل کریں گے۔ نہ الگ کوئی باب نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا ہے۔ البتہ پہلے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خواب کا ذکر ہے جس میں آپ نے خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو دیکھا تھا اور دجال پر بھی آپ کی نظر پڑی تھی۔ اور بس۔

بات یہ ہے کہ متقدمین کی کتابوں میں ان کے وضاع وکذاب تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ یا جلد بندیا نقل کرنے والے کاتبوں کو جہاں موقع مل جاتا تھا وہاں کچھ حدیثیں داخل کر دیتے تھے۔ کبھی مستقل طور سے ایک باب ہی الگ سے قائم کر کے لگا دیتے تھے اور بعض وقت تو وہ حدیثیں یا باب بے محل ٹھونس دیئے جاتے تھے۔ اسی کی ایک مثال یہ باب نزول عیسیٰ بن مریم بھی ہے جس کو ٹھونسنے کی گنجائش کتاب الفتن میں تو یاران طریقت کو نہ ملی۔ کتاب بدء الخلق میں بے جوڑ طریقے سے ایک باب قائم کر کے صرف دو حدیثیں اس میں بنا کر درج کر دیں جو غریب امام بخاری کے سر منڈھ دی گئیں۔ واللہ اعلم

میرا حسن ظن یہی ہے کہ امام بخاری ان موضوع و مکذوب حدیثوں کے ذمہ دار نہیں ہیں جو ان کی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ جن لوگوں نے ان کی کتاب میں ان موضوعات کو داخل کر دیا وہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن چونکہ یہ حدیثیں امام بخاری کے سر تھوپی جا چکی ہیں اسلئے سردست اپنے حسن ظن سے قطع نظر کر کے مجھ کو بذات خود امام بخاری رحمہ اللہ ہی کو مخاطب قرار دیکر کچھ عرض کرنا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میرا وہ حسن ظن باقی نہ رہا، یا میں نعوذ باللہ امام بخاریؒ کی شان میں گستاخیاں کر رہا ہوں۔

بندۂ ہمت اسلافم و آں سفلہ نیم ——— کہ خورم من نمک و باز نمکداں شکنم

(تمنا غفرلہ)

بخاری کی پہلی حدیث

بخاری کی پہلی حدیث حدثنا اسحٰق انا یعقوب بن ابراھیم کر کے شروع ہوتی ہے۔ یہ اسحٰق کون ہیں؟ اللہ ہی جانے۔ امام بخاری پندرہ[۱۵] اسحٰق سے روایت کرتے ہیں۔ شارحین کہتے ہیں کہ یہاں اسحٰق بن ابراہیم مراد ہیں۔ تو امام بخاری سات[۷] اسحٰق بن ابراہیم سے روایت کرتے ہیں۔ اسحٰق[۱] بن ابراہیم بن یزید ابو النضر الفرادیسی۔ اسحٰق[۲] بن ابراہیم بن نصر البخاری ابو ابراہیم السعدی۔ اسحٰق[۳] بن ابراہیم بن مخلد بن ابراہیم بن مطر۔ المعروف بابن راہویہ۔ اسحٰق[۴] بن ابراہیم بن محمد الصواف الباہلی ابو یعقوب البصری۔ اسحٰق[۵] بن ابراہیم بن العلاء بن الضحاک ابو یعقوب الحمصی۔ اسحٰق[۶] بن ابراہیم بن عبد الرحمٰن بن منیع البغوی ابو یعقوب اسحٰق[۷] بن ابراہیم ابی اسرائیل بن کامجرا ابو یعقوب المروزی نزیل بغداد (روی عنہ البخاری فی الادب)

غرض اگر کہیں امام بخاری حدثنا اسحٰق بن ابراھیم بھی لکھیں جیسا کہ متعدد جگہ ہے تو قطعی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کون اسحٰق بن ابراہیم ہیں۔ لیکن ابو علی الجبّائی نے یہاں اسحٰق بن راہویہ یا اسحٰق بن منصور میں سے کسی کے ہونے کا امکان ظاہر کیا ہے چونکہ یہاں صرف اسحٰق ہے بلا اظہار نسبت۔ مگر ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ یہاں اسحٰق بن راہویہ ہی مراد ہیں کیونکہ ابن راہویہ کی عادت ہے کہ وہ حدثنا کبھی نہیں کہتے۔ جب کہتے ہیں تو اخبرنا ہی کہتے ہیں (اور یہاں انا ہے جو اخبرنا کا مخفف ہے) اس لئے یقیناً ابن راہویہ ہی یہاں مراد ہیں۔

میں نے صحیح بخاری پر ایک سرسری نظر دوڑائی تو ابن حجر کے اس استقرار کو غلط پایا۔ ابن راہویہ عام محدثین کی طرح صرف عن کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں جیسے بخاری جلد اول صـ۱۸ باب فضل من علِمَ و علّم میں امام بخاری لکھتے ہیں حدثنا اسحٰق عن ابی اسامہ حاشیہ بین السطور میں لکھا ہے کہ یہ ابن راہویہ ہیں۔ اور حاشیہ پر جہاں قسطلانی و تقریب وغیرہ سے اسماء الرجال کی تشریح ہے اس میں لکھتے ہیں کہ جب اسحٰق بغیر کسی نسبت کے ہو تو صحیح بخاری میں ابن راہویہ ہی مراد ہوں گے۔ جیسا کہ جُبّائی نے (سعید) ابن السکن کا قول نقل کیا ہے۔ لیکن یہ بھی اس سرسری مطالعے میں غلط ہی ٹھہرا۔ اسی جلد اول صـ۲۴ باب من خص العلم قوماً دون قوم میں امام بخاری فرماتے ہیں حدثنا اسحٰق بن ابراھیم یہاں ولدیت کی تصریح موجود ہے مگر شارح صاحب نے معین کر دیا کہ یہاں ابن راہویہ ہی مراد ہیں (اسحٰق بن ابراہیم بن مخلد کے باپ ابراہیم کا لقب راہویہ تھا) اسی طرح صـ۶۲ باب الاسیر و الغریم یربط فی المسجد میں اسحٰق بن ابراھیم ولدیت کی تصریح کے ساتھ ہے اور شارح و محشی دونوں کے نزدیک ابن راہویہ ہی مراد ہیں۔ باوجود اس کے کہ امام بخاری سات سات اسحٰق ابن ابراہیم سے روایت کرتے ہیں۔ آگے چلئے۔ صـ۲۹ باب اذا شرب الکلب فی الاناء میں حدثنا اسحٰق اخبرنا عبد الصمد ہے۔ یہاں بلا اظہار نسبت ولدیت ہے صرف اسحٰق۔ اور پھر صاف اخبرنا ہے۔ اسلئے اسحٰق ابن راہویہ کو یہاں ابن السکن ابو علی الجبائی، قسطلانی اور ابن حجر سب کے نزدیک بالاتفاق مراد ہونا چاہیئے۔ مگر اسماء الرجال والے حاشیہ میں جو قسطلانی سے ماخوذ ہے اس میں بھی اور فتح الباری میں بھی صاف انکار ہے کہ یہاں ابن راہویہ مراد نہیں ہیں بلکہ ابن منصور مراد ہیں۔ اور صـ۵۳ باب ما یستر من العورۃ میں ہے حدثنا اسحٰق ثنا یعقوب بن ابراھیم۔ مگر ابن حجر فتح الباری میں یہاں باوجود "ثنا" ہونے کے جو حدثنا کا مخفف ہے ابن راہویہ کے مراد ہونے کا بھی امکان ظاہر کرتے ہیں۔ ان مثالوں سے یہ صاف ظاہر ہے کہ صرف اسحٰق یا اسحٰق بن ابراھیم سے کسی نام

کی تعین جو شارحین حدیث کر دیتے ہیں وہ محض اٹکل پچو ہوتی ہے اور جو وجہ اس تعین کی وہ بیان کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہوتی اور یہ تعین صرف اسلئے کر دیتے ہیں کہ امام بخاری جو پندرہ[15] اسحٰق اور سات اسحٰق بن ابراہیم سے روایت کرتے ہیں ان میں بعض اسحٰق اور بعض اسحٰق بن ابراہیم مجروح و ناقابل اعتبار بھی ہیں اور امام بخاری اسی لئے ایسے مواقع میں نسبت و ولدیت کی ایسی تصریح نہیں کرتے جس سے کسی کی شخصیت معین ہو سکے۔ اگر وہ اس صحیح راوی کی شخصیت خود معین کر دیتے تو اس کی مجروحیت کی وجہ سے وہ روایت ناقابل اعتبار ٹھہر جاتی اور غلط نسبت ظاہر کرکے غلط شخصیت معین کر دیتے ہیں تو یہ کذب ہو جاتا ہے۔ یہ خیال کرکے امام بخاری نے نہیں۔ بلکہ ان کی کتاب میں ایسی حدیثوں کے داخل کر دینے والوں نے صرف اسحٰق یا اسحٰق بن ابراہیم لکھکر راوی کی شخصیت کو مبہم چھوڑ دیا تاکہ بعد والے حسن ظن سے کام لیکر کسی ثقہ ہی اسحٰق کو بطور خود متعین کر لیں۔ اگر بعد والوں کے بس میں ہوتا تو اس کا ذکر ہی نہ کرتے کہ فلاں فلاں مجروح اسحاق سے بھی امام بخاری نے روایت کی ہے مگر کیا کریں کہ خود امام بخاری نے اپنی تاریخ کی کتابوں میں اپنے شیوخ کی تصریح کر دی ہے اسلئے مجبور رہ گئے۔ اور دشواری یہ بھی تھی کہ اگر امام بخاری نے خود اپنے ان شیوخ پر کوئی جرح نہیں کی ہے تو ان کے معصروں نے یا ان کے بعض شیوخ نے جرحیں کی ہیں اور ان جرحوں کو شارحین بخاری چھپا نہیں سکتے تھے۔ لیکن متاخرین نے متقدمین کی ان جرحوں کی تاویلیں کرکے ان کو ہلکا کرنے کی کوششیں جہاں تک ہو سکیں ضرور کیں اور بعض متاخرین نے تو غیر مستند اسناد سے انھیں جارحین کی یا بعض دوسرے متقدمین کی توثیق بھی پیش کر دی تاکہ ان جعلی تعدیلوں کے ذریعے ان جرحوں کو معتدل کیا جا سکے۔

امام بخاری بیس شیوخ سے روایت کرتے ہیں فقط اسحٰق کی وساطت سے۔ اور ولدیت و نسبت کی مطلق تصریح بعض جگہ نہیں کرتے۔ جریر[1] بن عبدالحمید۔ جعفر[2] بن عون، حبان[3] بن ہلال، ابو اسامہ[4]، روح[5] بن عبادہ، عبدالرحمٰن[6] بن مہدی۔ عبدالصمد[7] بن عبدالوارث۔ عبدالرزاق[8]، عبدالقدوس[9] بن الحجاج ابو المغیرہ۔ عبیداللہ[10] بن موسیٰ، عیسیٰ[11] بن یونس، فضل[12] بن موسیٰ، ابو عامر[13] العقدی۔ عبدہ[14] بن سلیمان۔ معتمر[15] بن سلیمان، محمد[16] بن المبارک الصوری، نضر[17] بن شمیل، وہب[18] بن جریر بن حازم، یزید[19] بن ہارون، اور یعقوب[20] بن ابراہیم۔

اس میں شک نہیں کہ ان بیس شیوخ کے تلامذہ کی فہرست سے پتا لگایا جا سکتا ہے کہ کن حضرت سے کون اسحٰق صاحب روایت کرتے ہیں جیسے جریر بن عبدالحمید سے اسحٰق بن راہویہ ان سے روایت کرتے ہیں گو امکان کسی اور اسحاق کا بھی ہے مگر تہذیب التہذیب میں جریر بن عبدالحمید کے تلامذہ میں صاف طور سے اسحٰق بن راہویہ بتصریح نسبت موجود ہے۔ اگرچہ چند ناموں کے بعد وخلق لکھکر اس کا امکان باقی رکھا گیا ہے کہ دوسرے کسی اسحٰق نے بھی ان سے حدیثیں لی ہوں اور روایت کی ہوں۔ لیکن جہاں ان شیوخ کے تلامذہ میں بھی صرف اسحٰق لکھکر چھوڑ دیا گیا ہو وہاں کس طرح پتا لگایا جائے گا؟ مثلاً یعقوب بن ابراہیم کے تلامذہ میں امام ذہبی اور حافظ ابن حجر دونوں ہی صرف اسحٰق لکھکر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور یہ نہیں بتاتے کہ یہ کون اسحٰق ہیں۔ شاید کوئی یہ کہے کہ ہر اسحٰق کے ترجمے میں دیکھ لو کہ وہ یعقوب ابن ابراہیم سے روایت کرتا ہے یا نہیں۔ جو اسحٰق یعقوب بن ابراہیم سے روایت کرتا ہو بس سمجھ لو کہ جہاں حدثنا اسحٰق عن یعقوب بن ابراھیم ہے۔ وہاں وہی اسحٰق مراد ہیں۔ اسی طرح ان بیس[20] شیوخ کے اسحاقوں کا نہایت آسانی سے تصفیہ ہو جا سکتا ہے۔ مگر افسوس! کہ یہ طریقہ بھی کارآمد نہیں ثابت ہو سکتا۔ کیونکہ تقریباً اکانوے اسحاق ہیں جن سے صحاح میں حدیثیں مروی ہیں۔ اور یہ اکانوے اور ان کے علاوہ اکسو تیس

اسحاق سب ملا کر دو سو تئیس ۲۲۳ اسحاق ہیں جن سے صحاح کے باہر حدیثیں مروی ہیں۔ ان میں سے جن کے شیوخ زیادہ ہیں ان کے شیوخ میں سے چند مشہور و معروف اور ثقہ شیوخ کے نام لکھ کر وجماعۃ یا وخلق یا وغیرہم لگ لکھدیا کرتے ہیں۔ اب اس جماعۃ یا خلق یا وغیرھم میں تو اتنی گنجائش ہے کہ ان کے ہمعصر سارے شیوخ سما جاسکتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھئے کہ یعقوب بن ابراہیم کے ترجمے میں ان کے تلامذہ کی فہرست میں تو صرف اسحٰق لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔ مگر یہ علَم ہے اسم جنس نہیں ہے کہ وہ سارے دو سو تئیس اسحاقوں کو آپ اس کی وجہ سے یعقوب بن ابراہیم کے تلامذہ قرار دیدیں۔ آپ کسی ایک ہی اسحٰق کو معین فرمائیں گے۔ شارحین حدیث میں سے ابن حجر کے سوا دوسروں نے اسحٰق بن منصور یا ابن راہویہ لکھا ہے تو اب دیکھئے۔ ابن راہویہ اور ابن منصور دونوں کے تراجم میں دونوں کے متعدد شیوخ کے نام ابن حجر بھی لکھتے ہیں اور امام ذہبی بھی۔ مگر کوئی بھی دونوں میں سے کسی کے ترجمے میں ان کے شیوخ کی فہرست میں غریب یعقوب بن ابراہیم کا نام نہیں لکھتے تو اب بتائیے کہ حدثنا اسحٰق عن یعقوب بن ابراہیم جہاں ہو وہاں کس طرح پتا لگایا جائے کہ یہ کون اسحٰق ہیں۔ آپ کے بتائے ہوئے طریقے سے بھی تو کچھ کام نہ چلا۔ مگر میں تو آج اس کا بیڑا اٹھا چکا ہوں کہ امام بخاریؒ کا یہ مبہم اسحٰق والا معمہ حل کر کے رہوں گا۔ تو سنئے۔

یہ نہ اسحٰق بن راہویہ متوفی ۲۳۸ھ ہیں اور نہ یہ اسحٰق بن منصور متوفی ۲۵۱ھ ہیں۔ یہ دونوں مَروَزی تھے یعنی مرو کے رہنے والے اور دونوں ہی اواخر عمر میں نیشاپور آکر بس گئے تھے۔ غرض یہ دونوں ہم وطن تھے اور ہم وطن رہے۔ اسحٰق بن منصور چھوٹے تھے اسی لئے یہ اسحٰق بن راہویہ سے روایت بھی کرتے ہیں اور ان کے خاص شاگرد ہیں۔

"مرو" خراسان کا ایک قصبہ نیشاپور سے ستر میل کے فاصلے پر واقع تھا مگر ہم مثلہ معہ والی حدیث کی تنقید میں لکھ چکے ہیں کہ نیشاپور وضاعین وکذابین کا ایک بڑا مرکز تھا اور وہاں حدیثوں کی روایت کا بازار بہت گرم رہا کرتا تھا اسلئے اکثر محدثین وہاں کھنچ جاتے تھے۔ یہ دونوں ابن راہویہ اور ابن منصور بھی مرو سے وہاں کھنچ گئے اور وہیں رہے۔ ان دونوں کے شیوخ میں سے اہل مدینہ میں سے آپ کسی کو بھی نہیں پائیں گے۔ [1] دیکھئے ایک دراوردی یعنی عبدالعزیز بن محمد بن عبید بن ابی العبید الخراسانی کا نام آتا ہے جن کو مدنی کہتے ہیں۔ چونکہ یہ مدینے میں آکر رہ گئے تھے۔ ان کی مادری زبان فارسی تھی، مدینے میں آئے تو عربی بولنے اور سمجھنے کی مشق کرنے لگے۔ ابھی پوری طرح عربی زبان آئی بھی نہ تھی کہ لگے لوگوں کے دیکھا دیکھی حدیثیں روایت کرنے تو مغیرہ بن عبدالرحمٰن المدنی نے جو انہیں دیکھا کہ حروف کے تلفظ اور محاورات کے استعمال میں اور پھر اعراب کلمات میں بہت غلطیاں کیا کرتے ہیں تو ان کو حدیثیں روایت کرنے سے منع کیا اور کہا کہ انک کنت الی لسانک احوج منک الی ھذا یعنی تم اپنی زبان درست کرو صحیح عربی بولنے کی مشق کرو، تمہیں حدیثیں روایت کرنے سے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہ واقعہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ مدینے میں نو وارد تھے۔ ابن سعد آخر واقدی ہی کے کاتب تھے، انھوں نے لکھدیا کہ یہ مدنی ہیں، مدینہ ہی میں پیدا ہوئے اور مدینے ہی میں رہے، ان کے آبا و اجداد خراسانی تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو عربی ان کی مادری زبان ہوتی اور عربی بولنے میں ان سے زیادہ غلطیاں نہ ہوا کرتیں۔ غرض چونکہ ابن راہویہ بھی خراسانی تھے اسلئے ابن راہویہ کا سلسلہ روایت جو ان سے یا ران طریقت نے جوڑ دیا

[1] دیکھئے طلوع اسلام ماہ دسمبر ۱۹۵۲ء

وہ اسی مناسبت سے۔ ورنہ آپ دیکھیں کہ ابن راہویہ اور ابن منصور دونوں سے کوئی بھی کوفی، بصری، شامی، رازی، صنعانی، حرانی وغیرہ کے سوا کسی عربی الاصل مدنی، مکی سے روایت نہیں کرتا۔ یعقوب بن ابراہیم بن سعد جو خالص مدنی ہیں ان سے حدیثیں لینے کا موقع ان خراسانیوں کو جو مرو سے اٹھے تو نیشاپور ہیں آ بسے کب اور کہاں ملا؟ یعقوب بن ابراہیم کا مرو یا نیشاپور جانا ثابت نہیں۔ اور ابن راہویہ یا ابن منصور اگر مدینے آئے تھے تو کس زمانے میں آئے تھے۔ یعقوب بن ابراہیم کی وفات ۲۰۸ھ میں ہوئی۔ ابن راہویہ کی ولادت ۱۶۶ھ میں اور وفات ۲۳۸ھ میں ہوئی۔ یعقوب کی وفات کے وقت اگرچہ ابن راہویہ تیس ۳۰ برس کے تھے مگر یہ اسوقت غالباً مرو سے نیشاپور بھی نہ آئے ہوں گے اور ابن منصور ابن راہویہ سے بہت چھوٹے تھے ان کی وفات ۲۵۱ھ میں ہوئی۔ اگر یہ دونوں مدینے آئے ہوتے تو صرف یعقوب بن ابراہیم ہی سے کیوں حدیثیں لیتے؟ اسوقت مدینے میں اور بھی اکابر محدثین موجود تھے۔ یعقوب بن ابراہیم سے پہلے وفات پانے والوں میں مثلاً معن بن عیسیٰ بن یحییٰ ابو یحییٰ المدنی القزاز متوفی ۱۹۸ھ اور محدث المدینہ ابو اسمٰعیل محمد بن اسمٰعیل بن مسلم بن ابی فدیک دینار الدیلمی المدنی متوفی ۲۰۰ھ و اسمٰعیل بن ابی اویس المدنی محدث المدینہ متوفی ۲۲۶ھ وغیرہما۔ اور یہ وہ اکابر محدثین ہیں جن سے بخاری و مسلم و دارمی وغیرہم بڑے بڑے محدثین حدیثیں روایت کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو کیوں ابن راہویہ اور ابن منصور نے چھوڑ دیا؟ ان میں سے کسی سے تو دو ایک حدیث لی ہوتی۔ کیا یہ دونوں مرو سے یا نیشاپور سے مدینے آئے تھے صرف یعقوب بن ابراہیم سے کچھ حدیثیں لینے کیلئے اور یعقوب کے سوا کسی دوسرے کو بھی اس قابل نہ سمجھے کہ اس کی بھی کچھ حدیثیں لے لیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ اسحاق جن سے امام بخاری روایت کرتے ہیں اور وہ یعقوب بن ابراہیم سے روایت کرتے ہیں، وہ نہ اسحٰق بن راہویہ ہیں اور نہ اسحٰق بن منصور بلکہ وہ اسحٰق بن محمد بن اسمٰعیل بن ابی فروہ المدنی الاموی مولیٰ عثمانؓ ہیں۔ یہ بھی مدنی ہیں اور یعقوب بن ابراہیم بھی مدنی ہیں اس لئے ان کو یعقوب بن ابراہیم سے حدیثیں لینے کا بہت کافی موقع ملا۔ دیکھئے یہ یعقوب بن ابراہیم المدنی سے روایت کر رہے ہیں تو دوسرے مدنی ائمہ حدیث سے بھی روایت کر رہے ہیں مثلاً امام مالکؒ سے روایت کرتے ہیں۔ سلیمان بن بلال المدنی متوفی ۱۷۲ھ سے بھی روایت کرتے ہیں اور محمد بن جعفر بن ابی کثیر الانصاری الزرقی مولاہم المدنیؒ سے بھی روایت کرتے ہیں اور اس لئے یقیناً یعقوب بن ابراہیم المدنی سے بھی روایت کرنے والے یہی اسحاق بن محمد المدنی ہو سکتے ہیں اور ان سے امام بخاری کی روایت حدیث مشہور ہے تمام ائمہ رجال کو اس کا اعتراف ہے، چونکہ خود امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں اس کا ذکر کر دیا ہے لیکن یہ ہیں بہت مجروح۔ اسی لئے امام بخاری کے زمانے ہی میں ان سے حدیثیں روایت کرنے پر امام بخاری کو ان کے شیوخ اور ہمعصروں نے زجر و توبیخ شروع کر دی تھی، اسی لئے امام بخاری نے بعد کو احتیاط شروع کر دی اور جب ان کی کوئی حدیث لکھنے لگے تو صرف حدثنا اسحٰق لکھکر چھوڑ دیا اور ولدیت و سکونت کی نسبت کا اظہار ہی نہ کیا، تاکہ کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ یہ کون سے اسحٰق ہیں مگر صرف اسحٰق لکھنے سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ ابن ابراہیم نہیں ہیں۔ اگر کسی مجروح اسحٰق بن ابراہیم سے روایت کرتے ہیں تو صرف اسحٰق بن ابراہیم لکھتے ہیں۔

ان اسحٰق بن محمد بن اسمٰعیل (جن سے امام بخاری یہ حدیث روایت کر رہے ہیں) کے بارے میں امام ابو داؤد صاحب السنن سے کسی نے

لے تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۴۸ ترجمہ اسحاق بن محمد بن اسمٰعیل بن ابی فروہ ۱۲

پوچھا تو انھوں نے ان کو واہی قرار دیا اور جو حدیث یہ امام مالک اور عبیداللہ سے اور وہ زہری سے روایت کرتے ہیں، اس کے متعلق انھوں نے کہا کہ وہ حدیث نہ امام مالک کی ہے نہ عبیداللہ کی اور نہ زہری کی اور نہ یحییٰ بن سعید کی (جس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ حدیث انھوں نے ان لوگوں کے سر تھوپی) اور نسائی نے ان کو متروک الحدیث قرار دیا ہے اور دارقطنی نے ضعیف کہا ہے۔ حاکم نے کہا کہ امام بخاری نے جو ان سے حدیث روایت کی ہے تو لوگوں نے اس پر چشمکیں کی ہیں۔ ساجی نے اقرار کیا ہے کہ ان میں ضعف ہے۔ امام مالک سے تنہا ایسی بہت سی حدیثیں بیان کرتے ہیں جن کو اور کوئی نہیں بیان کرتا (تہذیب التہذیب جلد اول ص۲۴۸) امام بخاری کا لحاظ کرتے ہوئے لوگوں نے ان پر جرحیں کم کیں اور کم لکھیں ورنہ یہ زیادہ جرح کے مستحق تھے۔

تو امام بخاری کے "حدثنا اسحٰق" کا معنی تو حل ہو گیا۔ ان کے بعد یعقوب بن ابراہیم پھر ان کے والد ماجد ابراہیم بن سعد ہیں ان کے بعد پھر صرف صالح غیر منسوب کا نام آتا ہے۔ نہیں معلوم یہ کون صالح ہیں۔ شارحین بخاری نے جھٹ صالح بن کیسان کا نام لکھ دیا اور اس علم نکرہ کو معرفہ بنا کر غیر معین کو معین کر دیا۔ حالانکہ صالح نام کے اور بھی ایسے لوگ ہیں جن سے زہری نے روایت کی ہے یا کر سکتے تھے جو صالح بن کیسان کے ہمعصر تھے۔ صالح بن کیسان مدنی تھے تو ان کے ہمعصر مدینے ہی میں صالح بن محمد بن زائدہ بھی تھے۔ اور صالح بن ابی الاخضر الیمامی کی تو زہری سے روایت کا ذکر خود ابن حجر نے تہذیب التہذیب ج ۴ ص۳۸۱ میں کیا ہے۔ لیکن چونکہ صالح بن ابی الاخضر اور صالح بن محمد بن زائدہ مجروح غیر ثقہ وغیرہ ہیں اسلئے جب ان سے روایت ہوئی تو ان کے نام کو مبہم چھوڑ دیا گیا تاکہ شخصیت کی تعین نہ ہو سکے اور بعد والے حسن ظن سے کام لیکر کسی ثقہ صالح کا نام یہاں چسپاں کر دیں۔ محدثین کا تو یہ اصول رہا ہے اور رہنا بھی چاہئے کہ جہاں ایک نام کے متعدد ہمعصر راوی ہوں اور التباس و اشتباہ کا خطرہ ہو تو ایسے راوی کی ولدیت و سکونت وغیرہ کی تصریح کر کے اس کی شخصیت کو متعین کر دیتے ہیں۔ نہ کہ خاص کر ایسے ہی مواقع میں نام کو بلا تصریح نسبت مبہم چھوڑ دیں جہاں التباس و اشتباہ کا خطرہ ہو۔ یہ تو اسی وقت محدثین کرتے ہیں جب راوی مجروح و غیر ثقہ ہو تو اس کی شخصیت کو چھپانے کیلئے اس کے نام کو مبہم چھوڑ دیتے ہیں جیسا کہ امام بخاری نے ایسا اور بھی متعدد جگہ کیا ہے جس کا اعتراف خود ابن حجر وغیرہ ائمہ رجال کو ہے۔ چنانچہ ابن حجر ہی لکھتے ہیں کہ ابو علی الجیانی نے کہا کہ بخاری نے اپنی جامع صحیح میں جو بغیر کسی نسبت کے صرف احمد کہکر ابن وہب سے روایت کی ہے وہ احمد بن عبدالرحمٰن ابو عبداللہ ہیں اس کے بعد اور اس کے پہلے احمد بن عبدالرحمٰن کے متعلق جو اقوال ائمہ جرح و تعدیل کے ہیں ان کو نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ابن عدی نے ان کو ضعیف کہا ہے اور ان کی کچھ منکر حدیثیں بھی نقل کی ہیں۔ یہ اپنے چچا عبداللہ بن وہب بن مسلم القرشی (مولاہم) سے ایسی بہت سی حدیثیں روایت کرتے تھے جن کو ان کے سوا اور کوئی روایت نہیں کرتا تھا۔ جن میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے جو کہ بروایت امام مالک اپنے چچا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ باآواز بلند پڑھا کرتے تھے اور ایک حدیث یہ بھی کہ جہاد اگر کسی کے گھر کے دروازے پر بھی پہنچ جائے تو اسے والدین کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلے۔ اور اس طرح کی اور بھی کئی من گھڑت حدیثیں نقل کی ہیں۔ بوشنجی نے آخر ان کے متعلق کہا ہی کہ فہذا کذاب۔ مگر پھر بخیال امام بخاری کسی نے کہا کہ ان کی منکر حدیثیں محتمل تاویل ہیں۔ کسی نے کہا کہ ممکن ہے کہ ان کے چچا نے ان کو خصوصیت کے ساتھ کچھ حدیثیں دی ہوں جو دوسروں کو نہیں دیں۔ کسی نے کہا کہ انھوں نے ان

منکر حدیثوں سے رجوع کر لیا تھا۔ بہرحال امام بخاری ان کے حال سے باخبر تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ دوسرے لوگ بھی ان سے واقف ہیں۔ اس لئے ان کے نام کی تصریح نہ کی اور صرف احمد کہہ کر چھوڑ دیا۔

اسی طرح محمد بن یحییٰ بن عبداللہ بن خالد الذہلی النیساپوری جنھوں نے ابن الشہاب زہری کی حدیثوں کو جمع کرکے ایک بڑا مجموعہ الزہریات کے نام سے تیار کیا تھا اسلئے محدثین میں ان کی ایک ممتاز حیثیت ہو گئی اب ان پر کون جرح کر سکتا تھا۔ مگر معلوم نہیں کہ معاصرانہ چشمک کی وجہ سے یا ان کی کوئی ایسی بات معلوم ہو گئی جو اوروں سے پوشیدہ رہی کہ باوجود ہم وطن ہونے کے امام مسلم نے ان سے ایک حدیث بھی نہیں لی۔ اور امام بخاری نے لینے کو تو ان سے ۳۴ حدیثیں لیں مگر ان کے نام کو یا تو بغیر کسی نسبت کے مبہم رکھا اور صرف حدثنا محمد کہکر چھوڑ دیا، یا اگر ولدیت ظاہر بھی کی تو باپ کی جگہ دادا کا نام رکھدیا اور محمد بن عبداللہ کہا یا صرف پردادا کا نام ظاہر کیا اور محمد بن خالد کہا۔ حالانکہ سات سات محمد بن عبداللہ سے اور تین تین محمد بن خالد سے، اور بھی امام بخاری حدیثیں روایت کر رہے ہیں۔ کیا وہ اتنا نہیں سمجھ سکتے تھے کہ محمد بن عبداللہ یا محمد بن خالد کہنے کو محمد بن یحییٰ الذہلی کبھی نہیں سمجھے جاسکتے اور دوسرے محمد بن عبداللہ اور محمد بن خالد خواہ مخواہ سمجھے جائیں گے مگر پھر اس طرح کا التباس جانتے بوجھتے انھوں نے کیوں پیدا کیا؟ یقیناً اسی لئے کہ محمد بن یحییٰ الذہلی کی شخصیت کو واضح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چاہے وہ جس وجہ سے بھی ہو اور اس طرح کی متعدد مثالیں ہیں اور بھی پیش کر سکتا ہوں مگر طوالت تحریر سے ڈرتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ امام بخاری کے ساتھ یہ محض سوء ظن نہیں ہے کہ راویوں کے ناموں کے ساتھ وہ اسی طرح تدلیس کیا کرتے تھے اور یہاں تو بالخصوص اسحٰق کے نام میں کھلی ہوئی تدلیس ہے اور پھر صالح کے نام میں بھی۔ کیونکہ امام بخاری ایسے دس راویوں سے روایت کرتے تھے جن کا نام صالح تھا جن میں بعض ضعفاء و مجروحین بھی تھے ان دس میں سے کسی سے بلاواسطہ خود روایت کرتے تھے اور کسی سے بالواسطہ۔ تو پھر صرف "صالح" بغیر تصریح ولدیت و سکونت کہدینا لوگوں کو قصداً اشتباہ میں ڈالنا نہیں ہے تو کیا ہے؟

"صالح" کے بعد ابن شہاب زہری ہیں جن سے آپ خوب واقف ہو چکے۔ اگر اب تک ناواقف ہیں تو ماہ ستمبر ۱۹۵۰ء کا طلوع اسلام دیکھ لیجئے زہری کے بعد سعید بن المسیب ہیں جو بڑے لوگوں میں سمجھے جاتے ہیں مگر سنیوں میں سنی اور شیعوں میں شیعہ بنے رہے۔ چنانچہ شیعوں کی سب سے زیادہ مستند کتاب حدیث اصول کافی ص ۳ مطبوعہ نولکشور میں ہے کہ یہ حضرت علی بن الحسینؓ (زین العابدین) کے خاص معتمد علیہ لوگوں میں سے تھے۔ اسی لئے شیعوں کی کتب رجال میں ان کی توثیق مذکور ہے۔ بہرحال نہ سعید المسیب پر میرا الزام ہے نہ حضرت ابوہریرہ پر جن سے ابن المسیب اس حدیث کو روایت کر رہے ہیں۔ ان بے گناہوں پر تو یہ حدیث خواہ مخواہ تھوپی گئی ہے۔ اس کے ذمہ دار ابن شہاب زہری ہیں یا وہی امام بخاری کے شیخ اسحاق۔ لیکن زیادہ قرینہ یہی ہے کہ زہری ہی سے یہ من گھڑت حدیث دوسری من گھڑت حدیثوں کی طرح پھیلی۔ چنانچہ صحیح بخاری کی دوسری حدیث بھی زہری ہی سے لوگوں کو ملی۔ اس دوسری حدیث کو بھی دیکھ لیجئے۔

بخاری کی دوسری حدیث

دوسری حدیث کا سلسلہ روایت یہ ہے۔ امام بخاری، ابن بکیر، لیث، یونس، ابن شہاب، نافع، مولیٰ ابن قتادہ انصاری۔ سب سے پہلے یہ کہدینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں لیث اور یونس کے بھی صرف نام ہیں بغیر اظہار ولدیت وغیرہ کے۔ مگر یہاں وہ صورت اسحاق اور صالح کی نہیں ہے۔ کیونکہ امام بخاری بلاواسطہ لیث بن سعد کے سوا کسی دوسرے

لیث سے روایت نہیں کرتے تھے اسلئے یہاں التباس واشتباہ کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ اسی طرح لیث بن سعد یونس بن یزید الایلی کے سوا اور کسی دوسرے یونس سے روایت نہیں کرتے تھے اسلئے یہاں بھی صرف یونس لکھدینے سے وہی یونس بن یزید ہی سمجھے جائیں گے کوئی دوسرے یونس نہیں سمجھے جا سکتے۔

تو اس دوسری حدیث کو امام بخاری ابن بکیر سے روایت کرتے ہیں۔ ان کا پورا نام یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر المصری ہے۔ قریش کے موالی میں سے (غلام آزاد کردہ) تھے۔ ابوحاتم نے ان کے متعلق کہا کہ ان کی حدیث لکھ لی جائے مگر وہ سند و حجت نہیں ہے۔ نسائی نے ان کو ضعیف اور لیس بثقۃ کہا۔ یحییٰ بن سعید نے کہا کہ لیس بشئ یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ خود امام بخاری نے تاریخ صغیر میں لکھا ہے کہ تاریخ میں ابن بکیر نے جو کچھ اہل حجاز سے کہا ہے میں اس کی نفی کرتا ہوں۔ امام مالک سے یہ ایسی ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جو اور کسی کے پاس نہیں۔ اسی طرح لیث بن سعد سے بھی یہ ایسی بہت سی حدیثیں روایت کرتے ہیں جو اور کوئی بھی روایت نہیں کرتا۔ لیث بن سعد کے یہ ہموطن ضرور تھے بلکہ لوگ لکھتے ہیں کہ یہ لیث کے پڑوسی تھے مگر لیث کی وفات کے وقت یہ صرف بیس اکیس برس کے تھے اور یہ دن رات لیث کے ساتھ بھی نہیں رہے مگر ابوصالح عبداللہ بن صالح تو خاص کاتب تھے۔ لیث بن سعد کے ان کے پاس تو وہ حدیثیں ہوتیں۔ مگر یہ ایسی ایسی حدیثیں لیث کی طرف منسوب کر کے روایت کرتے تھے جو کاتب اللیث ابوصالح کے پاس بھی نہ تھیں۔ ان کو تو امام مالک سے موطا بھی سننے کا موقع نہ ملا۔ انھوں نے حبیب بن ابی حبیب کاتب امام مالک جو اول درجے کا رافضی خبیث اور مشہور وضاع وکذاب تھا جلد بندی کا کام کرتا تھا اور جس محدث نے اپنی کتاب جلد بندی کیلئے دی اسکی کتاب میں گھٹا و بڑھاؤ اور ردوبدل کر دیا کرتا تھا دیکھئے لسان المیزان و میزان الاعتدال ترجمہ حبیب بن ابی حبیب اسی کو انھوں نے موطا سنائی یا اسی سے سنی۔ مگر امام مالک سے ایسی ایسی حدیثیں ان کو خدا جانے کہاں سے مل گئیں جو انھیں کے پاس تھیں۔ غالباً وہ حدیثیں بھی حبیب بن ابی حبیب ہی سے حاصل کی ہونگی یا خود ساختہ ہوں لیکن امام بخاری کے استاد تھے اسلئے ان پر جو جرحیں بھی کیں تو دبی زبان سے کیونکہ متقدمین اپنی کتابوں میں لکھ گئے تھے ان جرحوں کو چھپا نہ سکے۔ مگر متاخرین میں سے ابن قانع مصری متوفی ۳۵۱ھ جو خود ضعیف و منکر الحدیث و متروک الحدیث تھے جن کی حدیثوں میں بقول ابن حزم کذب و وضع بھی بہت تھا (لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۳) اور خلیلی یعنی ابویعلی الخلیل بن عبداللہ بن احمد القزوینی متوفی ۴۴۶ھ نے ان کو بخیال امام بخاری صرف ثقہ لکھدیا ہے۔ تو آپ کا تعارف ابن بکیر سے تو ہو چکا اب لیث بن سعد بن عبدالرحمٰن الفہمی[۱] (ولادت ۹۴ھ وفات ۱۷۵ھ) کے دامن ثقاہت کے آلودۂ جرح ہونے سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ باوجود اپنی ثقاہت و صداقت کے شیوخ کے انتخاب میں اور حدیثوں کے سننے میں تساہل برتتے تھے (تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۵) چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ یونس بن یزید الایلی سے اس حدیث کو روایت کر رہے ہیں اگر واقعی روایت کر رہے ہیں اور یہ حدیث ابن بکیر کی خود ساختہ نہیں ہے تو اب یونس بن الایلی کا حال سن لیجئے۔ یہ ابن شہاب زہری کے ہموطن بھی اور ان کے رفیق خاص تھے مگر بقول امام احمد بن حنبل منکر الحدیث تھے۔ منکر حدیثیں بہت روایت کیا کرتے تھے۔ ابن شہاب کی حدیثوں میں ان کو محدثین نے سب سے زیادہ ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ ان کی حدیثیں حجت و سند نہیں ہیں۔ مصر کے قریب ۱۵۹ھ میں وفات پائی۔ ان کے بعد ابن شہاب زہری ہیں جن سے آپ واقف ہیں۔ انھیں سے پہلی حدیث بھی مروی تھی اور یہ دوسری حدیث بھی انھیں سے مروی ہے مگر وہ سعید بن المسیب کے سر تھوپی گئی تھی اس کو نافع بن عباس یا ابن عیاش کے سر تھوپا گیا ہے۔ ان کو "مولیٰ ابی قتادہ انصاری" کہتے ہیں چونکہ ان کے ساتھ رہتے تھے غالباً یہاں "مولیٰ" بمعنی رفیق اور دوست کے ہو۔ ورنہ یہ بنی غفار کی ایک انصاریہ کے غلام آزاد کردہ تھے صحاح میں ان سے بس یہی ایک روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ہے۔

---

[۱] لیث بن سعد کو یحییٰ بن سعید القطان بہت سوءِ ظن رکھتے تھے جس کا ذکر امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے صاحبزادے عبداللہ سے کیا (میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۲۳) ترجمہ حجاج بن ارطاۃ۔

غرض ایک حدیث تو حضرت ابوہریرہؓ نے سعید بن المسیب سے بیان کی اور دوسری حدیث لگاتھی ایک ایسے شخص سے جس سے صرف یہی دوسری حدیث کہی اور کوئی حدیث اس سے کبھی بیان نہیں کی۔ بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق بقول ابن شہاب (اسلئے کہ دونوں حدیثیں ابن شہاب ہی سے مروی ہیں) دو باتیں ابوہریرہؓ سے کہی تھیں (پہلی حدیث) ایک تو یہ کہ وہ آئیں گے تو انکی کیا حیثیت ہوگی اور وہ کیا کیا کریں گے تو فرمایا کہ وہ ایک عادل حَکَم ہوں گے صلیب کو توڑینگے، سور کو قتل کرینگے۔ جزیہ کو (یا حرب) کو روک دینگے اور اتنا مال لٹائیں گے کہ کوئی لینے والا نہ ہوگا یہاں تک کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔ اس حدیث کو ابوہریرہ نے سعید بن المسیب سے بیان کیا۔ دوسری حدیث کہ بقول ابن شہاب رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اس وقت تم کس طرح ہوگے جب کہ ابن مریمؑ تم میں اترینگے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ دونوں باتیں جب حضرت عیسیٰؑ ہی سے متعلق تھیں تو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں باتیں ابوہریرہؓ سے کہی تھیں اسی طرح ابوہریرہؓ کو بھی لازم تھا کہ جس سے کہتے دونوں باتیں کہتے تاکہ ان کے ہر شاگرد کو حضرت عیسیٰؑ کے متعلق دونوں حدیثیں معلوم رہتیں۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا کہ ایک حدیث ایک سے کہی اور دوسری حدیث دوسرے سے۔ یہ بھی عجیب و غریب بات ہے۔

مضمون حدیث کی تنقید بہت دلچسپ ہوگی مگر سب حدیثوں کے مضامین پر ایک یکجائی تبصرہ انشاء اللہ تنقید رجال کے بعد کیا جائے گا۔

وباللہ التوفیق وھو حسبی ونعم الوکیل۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔　　　(تمنا عمادی غفرلہ)

استدراک

اسمیں کوئی کلام نہیں کہ رجال کی تنقید میں جودتِ نظر اور وسعتِ نگاہ علامہ تمنا کو عطا ہوئی ہے اسکی نظیر ہمارے دور میں تو ایک طرف صدیوں پیچھے تک بھی نہیں ملتی اور جس طریق سے وہ حدیث کو قرآن کے مثل قرار دینے والوں کو خود انہی کے حربوں سے شکست دیتے ہیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس اعتبار سے علامہ تمنا کی یہ کاوش اہلِ تحقیق کے نزدیک قابلِ قدر قرار پائیگی ـــــ جہانتک قرآن کا تعلق ہے ساری بات دو فقروں میں ختم ہوجاتی ہے یعنی

(۱) حضرت عیسیٰؑ دیگر انبیائے کرام کی طرح وفات پاگئے ـــــ اور ـــــ (۲) قرآن کی رو سے کوئی مرا ہوا دوبارہ دنیا میں نہیں آیا کرتا۔

لہٰذا نزولِ مسیحؑ کا عقیدہ ہی غیر قرآنی ہے لیکن ذرا ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہمارے دور میں ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اسے براہِ راست خدا کی طرف سے وحی یا الہام ہوتا ہے اور وہ اس علمِ خداوندی کی روشنی میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں وہی مسیح ہوں جسے دوبارہ آنا ہے۔ دعویٰ اس کا یہ ہے اور اسکے علم کی حقیقت یہ ہے کہ جن حدیثوں پر وہ اپنے دعوے کا مدار رکھتا ہے ان کے راویوں کے ضعف و ثقاہت کے متعلق اسکی معلومات اتنی بھی نہیں جتنی اللہ کے اس بندہ "تمنا" کی ہیں جس نے کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

دوسری طرف ہمارے مولوی صاحبان کو دیکھئے کہ وہ مرزا صاحب کی زندگی میں بھی اور اسکے بعد آجتک گتھم گتھا ہوتے چلے آرہے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنا تو برحق ہے لیکن وہ عیسیٰ مرزا غلام احمد نہیں ہیں (ان میں صرف قدامت پرست مولوی ہی نہیں بلکہ ماڈرن مُلّا بھی شامل ہیں۔ مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ واپس بلالیے گئے) اگر ان حضرات کی قسمت میں قرآنی بصیرت نہیں بھی لکھی تھی تو بھی اگر یہ ان حدیثوں کے راویوں پر تنقیدی نگاہ ڈال لیتے تو نزولِ مسیحؑ کا جھگڑا ختم ہوجاتا لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ انکے ہاں تنقید جرمِ عظیم ہے جو کچھ انھیں باپ دادا سے ورا ثۃً ملا ہے اس کے متعلق تحقیق یا تنقید کا خیال تک بھی دل میں لانا انکے نزدیک انسان کو ابدی جہنم کا مستوجب بنا دیتا ہے۔ نزولِ مسیحؑ، آمدِ مہدیؑ، بعثتِ مجددین وغیرہ قسم کے تصورات سب اسی کورانہ تقلید کے نتیجے ہیں۔ جن کا دین میں کوئی وجود نہیں لیکن قوم کی بدبختی ملاحظہ کیجئے کہ دین کیلئے کوئی شخص اپنی چھنگلیا میں سے خون کا ایک قطرہ دینے کیلئے تیار نہیں لیکن ان عقائد کیلئے سینکڑوں قیمتی جانیں قربان کردی جاتی ہیں اور ہزاروں گھرانے تباہ و برباد ہوجاتے ہیں۔　　　(طلوعِ اسلام)

باب المراسلات

طاہرہ کے نام

طلوع اسلام بابت جون ۱۹۵۳ء میں طاہرہ کے نام میرا پہلا خط شائع ہوا ہے جس میں میں نے بتایا ہے کہ قرآن کی رو سے عورت کا مقام مرد سے کم نہیں ہے اور مردوں کو عورتوں پر حاکم نہیں بنایا گیا۔ اس ضمن میں بعض احباب کی طرف سے خطوط موصول ہوئے ہیں جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان دو نکات کی بھی وضاحت کی جائے کہ (۱) وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے سے آدھا کیوں ہے؟ اور (۲) شہادت کیلئے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر کیوں قرار دیا گیا ہے۔ یہ مقامات خود میرے سامنے تھے اور جیسا کہ میں نے اس خط کے آخر میں لکھا ہے، میرا ارادہ یہ تھا کہ یہ اور اسی ضمن کے دیگر امور آئندہ خطوط میں بتدریج واضح کئے جائیں۔ لیکن چونکہ متذکرہ صدر خطوط سے مترشح ہوتا ہے کہ قارئین کے دل میں ان دو مقامات کے متعلق کھٹک سی پیدا ہو رہی ہے اسلئے میں نے مناسب سمجھا کہ ان کی وضاحت جلدی کر دی جائے۔

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے۔ قرآن میں ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے (ملاحظہ ہو ۴/۱۱) جیسا کہ میں نے طاہرہ کے نام خط میں بتایا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جس میں اکتسابِ رزق کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے ذمے ہوتی ہے کیونکہ ان فرائض و واجبات کی ادائیگی سے جو بنیادی طور پر عورت کے ذمہ ہوتے ہیں، عورت کو اتنی فرصت نہیں ملسکتی کہ وہ اکتسابِ رزق کا بوجھ اٹھا سکے۔ اب ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں اکتسابِ معاش کی ذمہ داری مرد کے سر پر ہو اس میں معاشی اسباب کی تقسیم میں مرد کا حصہ یقیناً زیادہ ہونا چاہئے۔ یہ وجہ ہے کہ ترکہ میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رکھا گیا ہے۔ لڑکیوں نے نہ اپنے لئے کمانا ہے نہ اپنی اولاد کے لئے۔ اس کے برعکس لڑکے نے اپنے لئے بھی اکتسابِ رزق کرنا ہے اور اپنے بیوی بچوں کیلئے بھی۔

لیکن اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مرد اپنے اس فریضہ کو نظر انداز کر رہے ہوں اور لڑکیوں کے متعلق اندیشہ ہو کہ وہ کس مپرسی کی حالت میں رہ جائیں گی تو قرآن نے متوفی کو پورا پورا حق دیا ہے کہ وہ اپنے ترکہ کی تقسیم اقتضائے حالات کے مطابق جس طرح جی چاہے (از روئے وصیت) کر جائے۔ قرآن کے مقرر کئے ہوئے حصے اس صورت میں عمل میں آتے ہیں جب متوفی بلا وصیت کئے مر جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہوتی ہو۔ قرآن میں اس کی صراحت موجود ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ لڑکی کا حصہ کم مقرر کرنے سے نہ تو اس کے حقوق میں کمی آجاتی ہے اور نہ ہی معاشرہ میں اس کا مقام مرد سے نیچے رہ جاتا ہے۔

دوسرا نقطہ ہے شہادت کے متعلق۔ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں ہے کہ جب تم آپس میں قرضہ کا معاملہ کرو تو اسے ضبطِ تحریر میں لے آؤ

اور اس پر دو مرد بطور گواہ بلا لیا کرو۔ اس سے آگے ہے فان لم یکونا رجلین فرجل و امرأتان۔ کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو بطور گواہ بلا لیا کرو۔ دو عورتیں کیوں بلائی جائیں اس کی علت قرآن نے خود ہی بیان کر دی ہے جہاں کہا کہ "یہ اسلئے ہے کہ

ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخریٰ۔

عام طور پر اس آیت کے یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ دو عورتوں کی اسلئے ضرورت ہے کہ "ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے"۔ لیکن قرآن نے تضل کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی نسیان (بھول جانے) سے مختلف ہیں۔ اس کے بنیادی معنی ہیں، بات کا مبہم یا غیر واضح سا ہو جانا۔ ذہن میں الجھاؤ سا پیدا ہو جانا۔ زیادہ واضح الفاظ میں (TO GET CONFUSED, OR BECOME PERPLEXED) اس آیت سے یہ تنقیحات پیدا کی جاتی ہیں کہ (۱) ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کو کیوں ضروری قرار دیا گیا۔ اور (۲) یہ بات خصوصیت سے عورتوں کے متعلق کیوں کہی گئی کہ یہ اس لئے ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ الجھاؤ سا پیدا ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

اور اس سے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن کے نزدیک عورتیں مردوں کے مقابلہ میں کم قابلِ اعتماد ہیں اور ان میں ذہنی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔

جہاں تک قابلِ اعتماد ہونے کا تعلق ہے، قرآن نے شہادت میں مردوں کیلئے بھی دو کی شرط عائد کی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ قرآن مردوں کو بھی قابلِ اعتماد قرار نہیں دیتا۔ اسی لئے ایک کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ایک کے ساتھ دوسرے کی شہادت بھی ضروری قرار دی گئی ہے؟ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصود یہ نہیں کہ ایک مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک کے بیان میں سہو یا سقم رہ جائے تو دوسرے کے بیان سے اس کی کمی پوری ہو جائے۔ یعنی اس سے ایک امکانی احتمال کی قانونی روک تھام مقصود ہے۔ مردوں کے متعلق یہ فتویٰ دینا مقصود نہیں کہ مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتے اسلئے ان میں سے کسی ایک (تنہا) کی شہادت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یعنی مقصود شہادت کی توثیق ہے نہ کہ مردوں کے ناقابلِ اعتماد ہونے کا اعلان۔

اسی طرح، جب قرآن نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو ضروری قرار دیا ہے تو اس سے بھی یہ مقصود نہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں کم قابلِ اعتماد ہوتی ہیں اسلئے ایک مرد کی جگہ دو عورتیں ضروری ہیں۔ یہاں بھی مقصود ایسا طریقہ اختیار کرنا ہے جس سے شہادت زیادہ سے زیادہ یقینی ہو جائے۔ ورنہ جہاں تک مردوں اور عورتوں کے تقابلی (COMPARATIVE) اعتماد کا تعلق ہے۔ قرآن نے دونوں کو ایک ہی حیثیت دی ہے۔ مثلاً قرآن میں جہاں لعان کی شہادت کا ذکر ہے وہاں ایک عورت کی شہادت کو بھی ایسا ہی قابلِ قبول قرار دیا ہے جیسا ایک مرد کی شہادت کو۔ (ملاحظہ ہو ۲۴/۶-۹)

اب سوال دوسرا باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن نے بالخصوص عورتوں کے متعلق کیوں کہا ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اشتباہ لاحق ہو جائے، کچھ گھبراہٹ سی ہو جائے تو دوسری عورت بات صاف کر دے۔

یہ ظاہر ہے کہ اس تقسیمِ فرائض کی رو سے (جس کا ذکر میں نے اپنے خطاب میں کیا ہے) یعنی عورتوں کیلئے اولاد کی پرورش و تربیت کا

فریضہ اور مردوں کے ذمہ اکتسابِ رزق کی ذمہ داری) یہ ضروری تھا کہ مردوں اور عورتوں کی حیاتیاتی ساخت Biological Constitution میں فرق ہوتا۔ ان دونوں میں یہ فرق بدیہی ہے۔

پھر، چونکہ حیاتیاتی ساخت کا اثر انسان کی نفسیات (PSYCHOLOGY) پر بھی پڑتا ہے اس لئے مردوں اور عورتوں میں اس حد تک نفسیاتی فرق بھی ضروری تھا۔ اسی نفسیاتی فرق کا ایک نتیجہ تو بالکل واضح ہے کہ مرد اکتسابِ رزق کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے کہ اولاد کی پرورش کے متعلق وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گیا ہے لیکن عورت، اولاد کی پرورش کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے اور اس پر بھی مطمئن نہیں ہوتی۔ اس کا جی یہ چاہتا ہے کہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بھی بچے کے اندر انڈھیل دے یا اگر اس کا بس ہو تو اپنا سینہ چیر کر بچے کو دل کے اندر سمو لے۔ (وہ بچے کو چھاتی سے لگا کر جس زور سے کھینچتی ہے، وہ لاشعوری طور پر اس جذبہ کا مظاہرہ ہوتا ہے)۔ مردوں اور عورتوں کی اس حیاتیاتی ساخت اور نفسیاتی اختلاف کے اثرات یا نتائج کیا ہوتے ہیں، اس کے متعلق مغرب کے علمائے نفسیات بہت کچھ تحقیق کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ہارڈنگ (M.ESTHER HARDING) نے ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے THE WAY OF ALL WOMEN)۔ جہاں تک اس نقطہ کا تعلق ہے جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے، وہ اس میں لکھتا ہے کہ

> اگر مردوں کو انسان کے باہمی تعلقات (HUMAN RELATION SHIP) کے مسائل سے متعلق کام پر لگایا جائے تو یہ کام ان کیلئے کبھی خوش آئند نہیں ہوتا لیکن عورتیں ایسے کام بہت پسند کرتی ہیں۔
>
> عورتوں کیلئے مشکل مقام وہ ہوتا ہے جہاں ان سے کہا جائے کہ وہ کسی مسئلہ کی جزئیات کو پوری پوری صحت کے ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔ (Accurately) بیان (Define) کردیں۔ (صفحہ ۳۱)

یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کے متعلق تو شاید ابھی حتمی طور پر کچھ نہ کہا جا سکے، لیکن ڈاکٹر ہارڈنگ کا بیان ہے کہ یہ وہ قدرِ مشترک ہے جسے اس نے متعدد عملی مثالوں کے بعد پایا ہے۔

اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو آپ دیکھئے کہ قرآن نے اس کی کسقدر رعایت رکھی ہے۔ مقدمات میں ہمیشہ جزئیات پر بحث و تنقید اور جرح و تنقیح ہوتی ہے۔ مقدمہ کی جزئیات کو پوری پوری صحت کے ساتھ بیان (Accurately Define) نہ کرنے ہی سے شہادت خراب ہوتی ہے اور شہادت کی توثیق کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس قسم کے باریک اختلافات کی صحت ہو جائے۔ عورتوں میں ایک تو وہ نفسیاتی کمی ہوگی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان فرائض کی سرانجامدہی میں مصروفیت کے باعث جو عورتوں سے مختص ہیں ان کیلئے مردوں کے مقابلے میں معاملات میں حصہ لینے کے مواقع بھی کم ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ متنازعہ فیہ معاملات (مقدمات وغیرہ) میں، جہاں بال کی کھال نکالی جائے گی۔ عورت بالعموم جزئیات کی صراحت میں غیر واضح رہ جائے گی۔ اسی چیز کو قرآن نے دوسرے مقام پر ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۂ زخرف میں بات یوں چلی آتی ہے کہ عرب کے مشرکین یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خدا کے بیٹیاں ہوتی ہیں۔ (وہ اپنی دیویوں کو اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا کرتے تھے)۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ علاوہ اس کے کہ یہ عقیدہ کسقدر باطل ہے کہ خدا اولاد بھی رکھتا ہے، ان کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اولاد میں سے بھی بیٹوں کو تو یہ اپنے لئے مخصوص کرتے ہیں اور

خدا کیلئے بیٹیاں منظر کرتے ہیں جن کی ان کے اپنے دل میں اتنی وقعت ہے کہ اگر کسی کو بیٹی کی پیدائش کی "خوشخبری" دی جائے تو اس کے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ جاتی ہے اس کے بعد ہے کہ یہ اُسے خدا کی اولاد قرار دیتے ہیں۔

من ینشؤا فی الحلیۃ وھو فی الخصام غیر مبین (۴۳/۱۸)

جو زیورات میں پرورش پاتی ہے[۵۱] اور جھگڑے کے وقت اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں غیر مبین (غیر واضح) رہتی ہے۔ متنازعہ فیہ امور (مقدمات وغیرہ) میں "غیر مبین" رہنا، وہی چیز ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے اور جسے سورۃ بقرہ میں تضل (ذہنی گھراہٹ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی شہادت، عورتوں کے ناقابلِ اعتماد ہونے یا ناقص العقل ہونے کی دلیل نہیں۔ نہ ہی اس سے مقصود یہ ہے کہ اس بنا پر مردوں کو عورتوں پر حقِ حکومت حاصل ہے۔ بلکہ (ڈاکٹر ہارڈنگ کی تحقیق کے مطابق) اگر ایک دائرے (یعنی جزئیات کی کما حقہ تبیین) میں عورتیں مردوں سے پیچھے ہیں تو دوسرے دائرے (یعنی انسانی تعلقات کے مسائل کے باب) میں مرد عورتوں سے پیچھے ہیں۔ ایک دائرے میں ایک کی کمی ہے تو دوسرے میں دوسرے کی۔ (فضلنا بعضکم علیٰ بعض) معاشرہ میں ایک دوسرے کی کمی باہمی تعاون سے پوری ہو سکتی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم عمومی گفتگو کیا کرتا ہے، مستثنیات سے بحث نہیں کرتا۔ نہ ہی اس سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ مناسب تعلیم و تربیت سے انسان کی کسی صلاحیت کی کمی پوری نہیں کی جا سکتی۔ یہ دشوار ضرور ہوتا ہے لیکن ناممکن نہیں ہوتا۔

یہ ہے جو کچھ اس باب میں مَیں قرآن سے سمجھ سکا ہوں۔ جیسا کہ میں اپنے خط میں لکھ چکا ہوں، مرد اور عورت کے باہمی تعلقات[۵۲] اور معاشرہ میں ان کے مقام سے متعلق مختلف گوشے میرے پیشِ نظر ہیں جو اِن خطوط میں رفتہ رفتہ سامنے آتے جائیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

پرویز

---

۵۱ عورت کے ذوقِ آرائش کا موضوع الگ ہے۔

۵۲ عورت کے ضمن میں بھی قرآن نے کہا ہے کہ مردوں کو عورتوں کے مقابلہ میں ایک درجہ زیادہ حاصل ہے۔ اس کا ذکر بھی اپنے مقام پر کیا جائے گا۔

سلیم کے نام خطوط　اور　قرآنی فیصلے

دونوں کتابیں تیار ہو چکی ہیں۔ جن حضرات کے آرڈرز بک ہو چکے ہیں ان کی ترتیب کے مطابق تعمیل شروع کی جا رہی ہے ان کے ساتھ ہی معاونین خصوصی طلوع اسلام کو بھی کتابیں بھیجی جا رہی ہیں۔ اگر آپ نے ابتک آرڈر بک نہیں کرایا تو جلدی کیجئے تاکہ آپ کو مایوس نہ ہونا پڑے۔

ہیں آج کیوں ذلیل ؟

وہ کونسا مسلمان ہے جس کے دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ہم اسقدر پست اور ذلیل کیوں ہیں ؟ لیکن اس کا تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ اس کا جواب آپ کو ملے گا

اسبابِ زوالِ امت

میں۔ جو دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب ہے مختصر لیکن ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ۔ محترم پرویز صاحب کے قلم سے۔ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا؟ اس کتاب کا نسخہ ہر نوجوان کے سرہانے رہنا چاہئے کیونکہ اس سے ہم دوبارہ زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ ضخامت ایک سو پچاس صفحات۔ کتابت، طباعت، کاغذ معیاری، قیمت مجلد مع طلائی گرد پوش ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

نوٹ: جو حضرات زیادہ مقدار میں خرید کر نوجوانوں میں مفت تقسیم کرنا چاہیں ان کو خاص رعایت دی جائے گی۔

مُلّا کا مذہب کیا ہے؟

اور

وہ کس طرح قرآن کے خلاف ملا ازم کی خود ساختہ بنیادوں پر قائم ہے۔

اگر آپ صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو ــ تین اہم عنوانات ــ کا مطالعہ کیجئے جس سے ملا کے مذہب کے عجیب و غریب حقائق آپ پر منکشف ہونگے۔ مثلاً

(۱) تبدیل مذہب کرنے والوں کو قتل کر دیا جائے گا۔

(۲) غلام اور لونڈیاں بے حد و نہایت بلا نکاح حرم سراؤں کی زینت بنائی جا سکیں گی۔

(۳) یتیم پوتوں کو وراثت سے محروم رکھا جا سکے گا۔

یقیناً آپ کے دل میں بار بار سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ کیا درحقیقت اسلام یہی ہے اور کیا منزل من اللہ دین میں ان امور کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

قرآن کی روشنی میں ان تینوں مسائل کا حل اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو فوراً "تین اہم عنوانات" کا مطالعہ کیجئے۔ کتاب مجلد مع گرد پوش ضخامت ۲۱۲ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

اسلامی نظام

دورِ حاضر کی ایک بلند پایہ کتاب

جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں اور وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے وہ اہم مقالات شامل ہیں جنہوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضخامت ۱۸۴ صفحات۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید گلیزڈ۔ قیمت مجلد مع گرد پوش صرف دو روپے۔ علاوہ محصولڈاک۔

قرآنی دستورِ پاکستان

آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ادارۂ طلوعِ اسلام کی پیشکش

پاکستان کی آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے قرآن کی روشنی میں مرتب کردہ مسودۂ قرارداد مقاصد اور مسودۂ بنیادی اصولوں کی رپورٹ جو حکومت پاکستان کے اعلان کے جواب میں ادارہ کی طرف سے حکومت کو بھیجے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حکومت کی طرف سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید مولوی صاحبان کی طرف سے پیش کردہ بائیس نکات کا تجزیہ۔ اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات اور ان کے فکر و نظر کے تضادات پر تبصرہ غرض اس کتاب میں آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں وہ سب کچھ آگیا ہے جسے معلوم کرنے کی آپ کو ضرورت ہے۔

ضخامت ۲۲۴ صفحات - کتابت و طباعت دیدہ زیب - کاغذ عمدہ

قیمت مجلد مع گرد پوش دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

روزمرہ زندگی کے اہم
... و معاملات کے متعلق

قرآنی فیصلے

... جواہر کی عظیم الشان ... جس میں روزمرہ زندگی کے ہر قسم کے اہم
مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان
مسائل و معاملات میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے تمام سہاروں سے
بے نیاز کر دے گی۔ ... کی کتاب نہ کھیئے۔ اس سے قرآن کی بصیرت افروز راہ نمائی
حاصل ہوگی۔

ضخامت ... (۴۰۰) صفحات۔ قیمت مجلد چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی۔

Regd. No. S. 1089

جشن آزادی کی تقریب پر طلوع اسلام کی نئی پیشکش

جشن نامے

یہ ایک عجیب و غریب کتاب ہے جس کی مثال ہمارے لٹریچر میں نہیں ملے گی۔ آزادی کے بعد کتنے جشن کتنے کھیلے ہیں جشن آزادی کیا ہوتا ہے۔ جشن آزادی کی تقریب پر [illegible] کیا مشورے دے اور جشن منانے والوں [illegible] پر [illegible] آپ کو اس نئی کتاب میں ملیگا۔ جس کا نام ہے

جشن نامے

یہ کتاب [illegible] مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع ہے۔ شروع میں [illegible] مقالات ایسے ہیں جنہیں پڑھکر بیک وقت آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو [illegible] کے ایسے گہرے نشتر اور اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر [illegible] کہیں نہیں ملیں گے۔ کتاب [illegible] ہے ہمارے چھ سالہ دور آزادی کی سسکتی ہوئی تاریخ ہے۔

ضخامت ۳۵۶ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے۔

[illegible] کا لکھئے کیونکہ کتاب محدود تعداد میں چھپی ہے۔

thai Compound, Bunder Rd., Karachi and Text at Adabi Pre
' Ahmed from Tulu-e-Islam Office Bunder Road, K